تذکیر القرآن

تفسیر

سورۂ یٰسٓ

محمد یوسف اصلاحی

مکتبہ ذکریٰ، رامپور یوپی
۲۴۴۹۰۱

تذکیر القرآن

تفسیر

سورۂ یٰس

محمد یوسف اصلاحی

مکتبہ
ذکریٰ
رام پور، یوپی

وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ
الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْہِ
تُرْجَعُوْنَ

آخر کیوں نہ میں اس کی بندگی کروں
جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اور جس
کے پاس تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

تفسیر ———— از ———— محمد یوسف اصلاحی
باہتمام ———— سعید اختر یوسفی
ناشر ———— مکتبہ ذکریٰ رام پور (یوپی)
مطبوعہ ———— شیروانی پرنٹرس دہلی
تعداد ———— دو ہزار
ہدیہ ———— آٹھ روپے
بار اوّل ———— ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۱ھ ———— فروری سنہ ۱۹۸۱ء

فہرست

تذکیر القرآن

تفسیر

سورۂ یٰسٓ

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور فضل و کرم سے ماہنامہ ذکریٰ کا اجراء اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء سے ہوا، اسی وقت سے ہر شمارے میں قرآن پاک کے کسی نہ کسی حصے کی تفسیر و تشریح اس میں ضرور دی جاتی رہی، اور پھر جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۶ھ مطابق جون سنہ ۱۹۷۶ء سے تسلسل کے ساتھ سورہ یٰسٓ کی تفسیر کا سلسلہ قسط وار شروع کیا گیا۔ الحمدللہ کہ یہ سلسلہ عام طور پر بھی پسند کیا گیا۔ اور بالخصوص فراہیؒ اسکول سے تعلق رکھنے والوں نے تو اسے بہت پسند کیا، چونکہ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے مدرسۃ الاصلاح میں مسلسل تین سال تک خصوصی طور پر استفادہ کرنے کا موقع بھی ملا جو علامہ فراہیؒ کے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور قرآن پاک کا گہرا علم رکھنے والے تھے، اس استفادے کا بھی تقاضا تھا کہ ذکریٰ میں قرآن پاک کی تفسیر کا سلسلہ خصوصی طور پر جاری رہے۔ الحمدللہ کہ سورہ یٰسٓ کی تفسیر ۲۴؍ ذوالحجہ سنہ ۱۴۰۰ھ م ۴؍ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء بروز سہ شنبہ مکمل ہوئی اور اب الگ مجموعے کی شکل میں پیشِ خدمت ہے۔

یہ مجموعہ پیش کرتے ہوئے صرف ایک ہی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرتب کا نام قرآن پاک کی خدمت کرنے والوں کی فہرست میں درج فرمالے ـــــ یہ سعادت ہی مرتب کے لئے سب کچھ ہے اور اللہ کی ذات سے توقع ہے کہ وہ اس سعادت سے محروم نہ رکھے گا۔

اس تفسیر میں کوشش کی گئی ہے کہ :-

- انداز عام فہم اور زبان آسان رہے،
- علمی بحثوں سے بچتے ہوئے، سادہ انداز میں قرآن کو سمجھنے کی طرف رہنمائی ہو،
- قرآن کو قرآن کے ذریعہ سمجھنے کی راہ کھلے،
- اور قرآن کو ایک تحریک کی کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے۔
- دعوت و تحریک اور حکمت و تربیت کے پہلو پر خصوصی توجہ دی جائے۔
- اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کو سمجھنے کا ذوق ابھرے، قرآن سے شغف بڑھے اور دل میں اس عظیم کتاب کی واقعی قدر و عظمت پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس ادنیٰ خدمت کو شرف قبول بخشے، مرتب کے لئے اس کو وسیلۂ نجات بنائے۔ قرآن سے تعلق رکھنے والے اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھائیں اور ان تمام معاونین اور مخلصین کے لئے بھی اس کو توشۂ آخرت بنائے جنھوں نے کسی بھی حیثیت سے اس کی اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ آمین

ابوسعد

۴؍ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ م ۸؍فروری ۱۹۸۱ء
یکشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ یٰسٓ

قرآنِ پاک کا دل

سورۂ یٰسٓ قرآن پاک کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ قَلْبًا وَّ قَلْبُ الْقُرْاٰنِ یٰسٓ۔ "دراصل ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل سورۂ یٰسٓ ہے۔" (جامع ترمذی باب فضائل القرآن)

سورۂ یٰسٓ کو قلبِ قرآن سے تشبیہ دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کو اُمّ القرآن کہا ہے، یعنی قرآن کی اصل اور بنیاد۔ سورۂ فاتحہ کو قرآن کی اصل اور بنیاد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ پورے قرآن میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ جو تعلیم دی گئی ہے، سورۂ فاتحہ میں اختصار کے ساتھ وہ پوری تعلیم موجود ہے، اسی طرح پورے قرآن میں شرح و تفصیل کے ساتھ جو دعوت پیش کی گئی ہے، سورۂ یٰسٓ میں وہ پوری دعوت اجمال کے ساتھ آگئی ہے، مگر اس قدر زور اور جوش کے ساتھ کہ گویا یہ سورہ قرآن کا دھڑکتا ہوا دل ہے اور قرآن کے اس دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ان قلوبِ انسانی کو ضرور ہی متاثر کرے گی جن میں دھڑکنے کی قوت ہے اور وہ سعید روحیں ضرور اس سے زندگی پائیں گی جن میں قبولِ حق کی گرمی موجود ہے ہاں قرآن کے دھڑکتے ہوئے دل کی یہ آواز ان لوگوں کو ہرگز متاثر نہ کرے گی جن کے قلوب، قبولِ حق کی صلاحیت اور اثر پذیری کے جوہر سے بالکل ہی خالی اور محروم ہوگئے ہیں۔

زمانۂ نزول

یہ سورت مکۂ مکرمہ میں نازل ہوئی، سورہ کے مضامین میں انذار کا مخصوص انداز، منکرینِ حق کی بربادی کے لرزہ خیز، عبرتناک تاریخی واقعات اور مخالفینِ رسول کو سخت دھمکیوں کے ذریعے جھنجھوڑنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ مکہ کا آخری دور شروع ہونے ہی والا ہے۔

سورۂ یٰسٓ کا موضوع

اس سورہ کا موضوع انذار ہے یعنی کفارِ قریش کو انکارِ رسالت کے بدترین انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ سورہ کے مضامین کا زور بتاتا ہے کہ کفارِ قریش نبیؐ اور نبیؐ کی دعوت کا انکار پوری ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی سے کر رہے ہیں، دعوت کا مذاق بھی اُڑا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی کر رہے ہیں، دعوت کو دبانے اور مٹانے کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں منکرینِ رسالت کو نہایت پُر زور اور دل دہلا دینے والے انداز میں اُس دردناک عذاب سے بھی ڈرایا گیا ہے جو آخرت میں پیش آنے والا ہے اور ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے وہ عبرتناک تاریخی حوادث بھی ان کے سامنے رکھے گئے ہیں جن سے اسی دنیا میں منکرینِ رسالت دوچار ہوئے ہیں یہ وہ قومیں ہیں جن کی تباہی کی داستانیں انھیں معلوم ہیں اور جن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈر انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اس انذار اور تنبیہ کے ساتھ ساتھ نہایت دلنشیں انداز میں یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ خدا کے رسولؐ توحید و آخرت پر ایمان لانے کی جو دعوت دے رہے ہیں وہ سرتاسر معقول اور حق ہے، آثارِ کائنات پر غور کرو۔ اپنی عقلوں سے کام لو، اپنے وجود پر غور کرو۔ ہر جگہ تمہیں اس کی صداقت کی نشانیاں ملیں گی اور یہ بھی تو سوچو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دعوت و تبلیغ کے لئے جو شب و روز گھُل رہے ہیں، طرح طرح کی مشقتیں اُٹھا رہے ہیں، ہر طرح کی اذیتیں برداشت کر رہے ہیں تو آخر کیوں؟ کیا تمہارے دل گواہی نہیں دے رہے ہیں کہ وہ بالکل بے غرض ہیں۔ وہ تم سے کسی اجر اور بدلے کے خواہاں نہیں ہیں، ایسے بے لوث اور صادق و امین رسول پر ایمان لاکر تم اپنا ہی بھلا کروگے اور اُن کا انکار کر کے یقیناً تم اُسی انجام سے دوچار ہوگے جس سے یہ رسول تمہیں ڈرا رہے ہیں۔ ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کے ماحول میں تفہیم و دعوت کا یہ نرم گرم انداز کچھ اس قدر پُرسوز، پُرجوش اور اثر انگیز ہے کہ جن میں ذرا بھی قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہو، وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

زندگی بعد موت کی کیفیات، اعمال کی جزا و سزا، مومنوں کا صلہ اور انعام، منکرینِ رسالت کا لرزہ خیز انجام، میدان حشر کی ڈانٹ پھٹکار، خدا کی زبردست پکڑ اور اس کے بے پایاں اقتدار کا نقشہ کچھ اس قدر اثر انگیز انداز میں کھینچا گیا ہے کہ دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور آدمی یہ نہیں سوچتا کہ کل میدانِ حشر میں یہ سب کچھ پیش آنے والا ہے بلکہ اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اس میدان میں موجود ہے اور وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، مجرموں کو دردناک عذاب میں کراہتے دیکھ کر اس کا دل لرز رہا ہے، فرمانبرداروں پر انعام کی بارشیں دیکھ کر اس کی روح وجد میں آ رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی آیات کا پُر تاثیر آہنگ، زوردار مضامین کا سوز و گداز، قیامت کی تذکیر اور یاد دہانی کا چبھتا ہوا اندازِ بیان ایسا دلپذیر ہے کہ دعوت کی صداقت دل میں بیٹھتی چلی جاتی ہے، سخت سے سخت دل بھی موم ہونے لگتے ہیں روح وجد کرنے لگتی ہے اور خدا کی توفیق حاصل ہو تو دل نورِ ایمان سے جگمگا اٹھتا ہے، اِلّا یہ کہ کسی کے کرتوتوں کی پاداش میں خدا نے اس سے توفیق ہی سلب کر لی ہو۔

مرنے والوں پر یٰسٓ پڑھا کرو

اسی مصلحت سے رحمتِ عالمؐ نے اپنی اُمت کو ہدایت فرمائی ہے کہ اپنے مرنے والوں پر یٰسٓ پڑھا کرو۔ حضرت معقل بن یسارؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِقْرَءُوْهَا عَلٰی مَوْتَاكُمْ اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰسٓ پڑھا کرو۔

مرنے والا جو اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اور دوسری دنیا میں داخل ہو رہا ہے ___ اس نازک موڑ پر ایک بار پھر اس کے ذہن میں اسلامی عقائد تازہ ہو جائیں اور خصوصیت کے ساتھ اس عالم کا پورا نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ جائے، جس میں یہ داخل ہو رہا ہے۔ اور وہ یہ جان لے کہ اس دنیا سے رخصت ہو کر آگے اُسے کن منزلوں سے گزرنا ہے اور کیا کیا پیش آنا ہے۔ اس تذکیر و یاد دہانی سے توقع ہے کہ وہ دل کی گہرائی سے اپنے رب کو یاد کرتا ہوا اس کے حضور جا پہنچے۔

اس تذکیر اور یاد دہانی کا حق ادا کرنے کے لیے یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرنے والا عربی زبان نہیں جانتا تو اس کو سورۂ یٰسٓ سنانے کے ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی اس زبان میں اس کے سامنے بیان کیا جائے جس کو وہ جانتا ہو، تاکہ تذکیر کا حق ادا ہو سکے۔

سورہ یٰسٓ کی فضیلت

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

مَنْ قَرَأَ یٰسٓ کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ بِقِرَاءَتِہَا قِرَاءَۃَ الْقُرْاٰنِ عَشْرَ مَرَّاتٍ۔

جس شخص نے سورہ یٰسٓ پڑھی، اس کو خدا دس قرآن پڑھنے کا اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ (ترمذی، فضائل القرآن)

اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس شخص نے شب میں سورہ یٰسٓ پڑھی، وہ اس حال میں صبح کرے گا کہ خدا نے اس کی مغفرت فرما دی ہو گی"۔

اسی مفہوم کی ایک روایت ابن حبان نے بھی نقل کی ہے:۔

"حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس نے شب میں سورہ یٰسٓ محض رضائے الٰہی کے لئے پڑھی خدا اس کی مغفرت فرما دے گا"۔

مشہور محدث علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ جس مصیبت اور مشکل میں بھی سورہ یٰسٓ پڑھی جائے گی خدا تعالیٰ اس کی برکت سے اُسے آسان فرما دے گا۔ مرنے والے کے پاس اس کی تلاوت سے رحمت و برکت کا نزول ہوتا ہے اور مرنے والے کی جان کنی میں آسانی ہوتی ہے۔

عظیم مفسر علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود النفسی نے اپنی مشہور تفسیر مدارک التنزیل میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

"جو شخص سورہ یٰسٓ پڑھے گا اگر وہ بھوکا ہو گا تو اللہ اس کا پیٹ بھر دے گا ——— اگر وہ پیاسا ہو گا تو اللہ اُسے سیراب کر دے گا ——— اگر وہ ننگا ہو گا تو خداوند عالم اُسے لباس عطا فرمائے گا ——— اگر وہ خوف و ہراس میں ہو گا تو خُدا اسے امن و سکون بخشے گا، اگر وہ وحشت زدہ ہو گا تو اللہ اس کی وحشت دور کر دے گا ——— اگر وہ محتاج ہو گا تو خدا اس کی احتیاج دور کر دے گا ——— اگر وہ جیل میں ہو گا تو اللہ اُسے رہائی دلوائے گا۔ اگر وہ قید میں ہو گا تو پروردگار اُسے آزاد کرا دے گا، اگر وہ راستہ

بھٹک گیا ہوگا تو خداوند عالم اس کی رہنمائی فرمائے گا، اگر وہ مقروض ہوگا تو اللہ اس کا
قرض اپنے خزانوں سے ادا کرا دے گا۔ پروردگار اس سے ہر مصیبت ٹال دے گا، اور اس
کی ہر حاجت پوری فرمائے گا۔"

بزرگوں نے کہا ہے کہ مرنے والے کے پاس جب سورۂ یٰسٓ پڑھی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جاں کنی کی شدت کو آسان کر دیتا ہے۔ سورۂ یٰسٓ کی اسی فضیلت اور عظمت کی وجہ سے خدا کے رسولؐ کی یہ خواہش تھی کہ میری امت کا ہر فرد اس سورہ کو اپنے دل میں رکھے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"میری خواہش ہے کہ میری امت کے ہر شخص کے دل میں سورۂ یٰسٓ محفوظ ہو۔"

مگر یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ سورۂ یٰسٓ کی یہ عظمت و فضیلت اور برکت و ہدایت اسی خوش نصیب کے لئے ہے جو ذہن و دماغ کی حاضری، قلب و روح کی یکسوئی، اور شعور و دلبستگی کے ساتھ اس کی تلاوت و سماعت کا اہتمام کرے اور اس کی تعلیم و ہدایت کے مطابق زندگی کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ۝

اس میں یاددہانی اور سبق ہے ہر اُس شخص کے لئے جو دل رکھتا یا جو حاضر رہ کر توجہ سے سنتا ہو۔

میری محسن کتاب

"جاہلیت کے زمانہ میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم وجدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں۔ مگر جب آنکھ کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ (Kant) ہیگل، (Hegel) نٹشے (Nietzsche) مارکس (Marx) اور دُنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں اُلجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے۔ ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ میری اصلی محسن بس یہی کتاب ہے اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔ حیوان سے انسان بنا دیا۔ تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر پردہ نہیں ہے، انگریزی میں اس کنجی کو (MasterKey) (شاہ کلید) کہتے ہیں۔ جس سے ہر قفل کھل جائے۔ سو میرے لئے یہ قرآن "شاہ کلید" ہے۔ مسائلِ حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔"

(ابوالاعلیٰ ؒ)

سورۂ یٰسٓ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰسٓ ﴿١﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤﴾

یٰسٓ[1]، قسم ہے قرآن حکیم کی[2]، بلاشبہ آپ رسولوں میں سے ہیں[3]، سیدھے راستے پر ہیں[4]،

[1] یٰسٓ حروفِ مقطعات میں سے ہے، یہ حروف چونکہ الگ الگ پڑھے جاتے ہیں اس لئے ان کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں، جیسے الٓمٓ، الٓرٰ، الٓمٓصٓ، حٰمٓ، طٰسٓ وغیرہ۔ یہ حروف مقطعات دراصل سورتوں کے نام ہیں جو ان سورتوں کے مرکزی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور مرکزی مضمون کے لئے گویا علامتی عنوان ہیں، مثلاً اسی سورہ پر غور کیجئے، یٰسٓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی ہے۔ اور اس سورہ میں رسالتِ محمدیؐ سے انکار کرنے والوں کو نہایت سخت انداز میں انذار ہے، کہ تمہاری اس مخالفت اور بغاوت کا انجام انتہائی بھیانک ہے۔ یٰسٓ کا مفہوم کیا ہے؟ اس بارے میں دو قول زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں، ایک یہ کہ قبیلہ بنی طی کی بولی میں اس کے معنی ہیں اے انسان! اے شخص! اور دوسرا یہ کہ یہ مخفف ہے یَا سَیِّدَ الْبَشَرِ کا۔ ان دونوں تاویلوں میں اس

کے مخاطب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ یٰسٓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی بھی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی سَمَّانِیْ فِی الْقُرْاٰنِ بِسَبْعَۃِ اَسْمَاءَ مُحَمَّدٍ وَّاَحْمَدَ وَطٰہٰ وَّیٰسٓ وَالْمُزَّمِّلِ وَالْمُدَّثِّرِ وَعَبْدِ اللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مجھے سات ناموں محمد، احمد، طٰہٰ، یٰسٓ المزمل، المدثر اور عبد اللہ سے یاد کیا ہے۔

۲ قرآن کو حکیم اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ خدائے حکیم کا کلام ہے، اور حکیم کا کلام بھی حکیم ہوتا ہے، خدا کی ذات حکمتوں کا سرچشمہ ہے اور قرآن حکمتوں کا صحیفہ، نیز قرآن کو حکیم اس معنی میں کہا ہے کہ اس کی آیات محکم ہیں، سورہ ہود آیت ۱ میں ہے کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں پختہ اور اٹل ہیں۔ اس کے الفاظ ومعانی میں کسی بھی پہلو سے کوئی خلل، عیب، نقص اور غلطی کا شائبہ نہیں۔ اس کی تعلیمات ہر خلل سے محفوظ ہیں۔ سورہ حٰمٓ سجدہ آیت ۴۲ میں ان دونوں حقیقتوں کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ کتاب ہے" یعنی قرآن کی تعلیمات اور اصول واحکام اس قدر پختہ، اٹل اور حق ہیں کہ اس کی کسی تعلیم اور اصول کو علم وعمل کی دنیا میں نہ براہ راست کوئی باطل اور فاسد ثابت کر سکتا ہے اور نہ کبھی کسی دور میں کوئی حقیقت اور صداقت ایسی منکشف ہو سکتی ہے، جو قرآن کے پیش کئے ہوئے حقائق کے خلاف ہو اس لیے کہ یہ محکم تعلیم اس خدا نے نازل کی ہے، جو حکیم ہے، اور اپنی ذات میں ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

۳ "قسم ہے قرآن حکیم کی" سورہ کا آغاز ہی قسم سے کیا گیا ہے اور قسم اسی بات پر کھائی گئی ہے کہ "یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں" یہ انتہائی پُرزور اور تاکیدی آغازِ کلام بتاتا ہے کہ اس وقت دعوتِ اسلام کے مخالفین پوری قوت سے جس حقیقت کی تردید، تکذیب اور انکار کر رہے تھے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا مسئلہ تھا اور یہی بات زبردست آویزش کی اصل بنیاد بنی ہوئی تھی۔ لہٰذا کسی تمہید کے بغیر خدا نے سورہ کا آغاز ہی ا حقیقت کے اثبات سے کیا، اس میں مسلمانوں کو بھی یقین واطمینان دلانا مقصود ہے اور مخالفینِ رسول کو بھی ہشیار کرنا ہے کہ رُک کر سوچ لو، یہ تم کس کی مخالفت کر رہے ہو! تفصیل تشریحی نوٹ ۴ میں آرہی ہے۔

قرآن کی قسم کھانے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کو اس حقیقت پر گواہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، جس پر قسم کھائی جا رہی ہے۔ یعنی جس چیز کی تکذیب اور انکار تم اس ڈھٹائی اور اندھے جوش کے ساتھ کر رہے ہو، اس پر خود یہ قرآن گواہ ہے، جو رسول پر نازل ہو رہا ہے اور جس کی آواز تمہارے کانوں میں بھی پڑ رہی ہے۔ اس کی صفت حکیم ہے، یہ

حکمتوں سے لبریز ہے حکمت وصداقت اور ہدایت وبصیرت کا یہ صحیفہ خود گواہ ہے کہ یہ خدا ہی کا کلام ہے اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

ہے۔ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں، آپ سیدھے راستے پر ہیں' ان دونوں آیتوں کا رُخ مسلمانوں کی طرف بھی ہے اور مخالفت کا طوفان اُٹھانے والوں کی طرف بھی۔ مسلمانوں کے لئے ان آیات میں جماؤ، قلبی اطمینان، شرحِ صدور اور یقین کی ٹھنڈک کا سامان ہے اور مخالفینِ رسول کے لئے دل ہلا دینے والی وارننگ اور فہمائش کا سامان ہے۔

جس زور اور قوت کے ساتھ رسولؐ کی تکذیب اور انکار کی مہم چلائی جارہی تھی، نئے نئے مسلمانوں کا اس سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ اس لئے رسول سے خطاب کرتے ہوئے دراصل ان کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً خدا کے رسول ہیں، وہ قرآن جو شب وروز رسولؐ تمہیں سنا رہے ہیں وہ خود گواہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔ اس لئے کہ یہ اسی قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر ہیں جو خدا نے نازل کیا ہے۔

رسولؐ سے خطاب کرکے یہ کہنا، "آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں، آپ سیدھے راستے پر ہیں" کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کی مسلسل تکذیب اور مخالفت سے نعوذ باللہ خدا کے رسول کسی شک اور تذبذب کا شکار ہو رہے تھے بلکہ رسولؐ کے واسطے سے یہ بات ان نئے مسلمانوں سے کہی گئی ہے جو اس طوفانی مخالفت سے متاثر ہو کر کسی وسوسے اور کمزوری کا شکار ہو سکتے تھے ـــــ قرآن میں یہ اندازِ بیان جگہ جگہ موجود ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے اور بات دراصل عام مسلمانوں کو سمجھائی گئی ہے ـــــ مثلاً سورۂ ہود آیت ۱۷ پر غور کیجئے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے، تو اس کے لئے جس ٹھکانے کا وعدہ ہے وہ جہنم ہے پس اے رسول! آپ اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑیں، یہ حق ہے آپ کے رب کی جانب سے مگر کم ہی لوگ مانتے ہیں۔

"آپ اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑیں" یہ بات رسولؐ سے خطاب کرکے کہی جارہی ہے مگر اس حقیقت

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

(یہ قرآن) عزیز اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے[۵] تاکہ آپ ایک ایسی قوم کو ڈرائیں[۶] جن کے آباو اجداد کو نہیں ڈرایا گیا تھا[۷] سو یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

میں دوسری رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ دراصل یہ بات عام مسلمانوں کو سنانا مقصود ہے۔ پیغمبر کو تو اپنے لائے ہوئے حق پر ایسا کامل اور پختہ یقین حاصل ہوتا ہے جس پر شک اور تذبذب کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا۔

پھر ان دونوں آیتوں کا رخ منکرینِ رسالت کی طرف بھی ہے۔ پہلی آیت اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں ان کو سخت وارننگ دے کر جھنجوڑا گیا ہے، عقل کے دشمنو! یہ تم کس کی تکذیب اور مخالفت کر رہے ہو، یہ مکے کے کسی عام انسان کی مخالفت نہیں ہے۔ یہ شہنشاہِ کائنات کے نمائندے کی تکذیب و مخالفت ہے۔ کیا تمہاری گستاخی ڈھٹائی اور بغاوت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ شہنشاہِ کائنات کے مقابلے میں آ رہے ہو! کائنات کا شہنشاہ قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ "تم یقیناً رسولوں میں سے ہو" اور تم اس معزز ہستی کو جھٹلا رہے ہو، خدا قرآن حکیم کو گواہ بنا کر کہہ رہا ہے کہ محمدؐ یقیناً خدا کے رسول ہیں۔ تم تعصب اور جہالت چھوڑ کر قرآن کی روشن اور حکیمانہ تعلیمات پر غور کیوں نہیں کرتے؟ کیا ایسا صحیفہ انسانی کلام ہو سکتا ہے؟ پھر دوسری آیت "عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" میں فہمائش کرائی گئی ہے کہ یہ رسول سیدھے راستے پر ہیں، یہ اس راستے پر ہیں جو قرآن کے ذریعے خدا نے ان کو بتایا ہے، تم ہی سوچو خدا کا راستہ چھوڑ کر بھی کوئی سیدھا راستہ پا سکتا ہے۔ اگر تم اپنے بدخواہ نہیں ہو تو اپنی روش پر غور کرو۔ آخر کیوں اپنی شامت بلا رہے ہو، اور کیوں اپنی دنیا اور عاقبت خراب کر رہے ہو!

۵۔ پچھلی آیتوں میں قرآن کو گواہ بنا کر مومنین کو تسلی دی گئی تھی اور مخالفین کو سخت تنبیہ کی گئی تھی اب اس آیت میں قرآن نازل کرنے والے خدا کی دو صفات "عزیز" اور "رحیم" بیان کر کے اس تسلی اور تنبیہ کے مضمون کو اور زیادہ مدلل، پرزور اور دلنشین بنایا گیا ہے۔

"عزیز" اس ہستی کو کہتے ہیں جو سب پر غالب ہو، کوئی اس کی گرفت سے باہر نہ ہو، جس کا فیصلہ سب پر نافذ ہو اور کسی کو اس کے فیصلے سے سرتابی کی مجال نہ ہو، جس کے آگے سب بے بس مجبور اور مغلوب ہوں۔

"رحیم" وہ ہستی ہے جو اپنے بندوں پر مسلسل رحم کرتی ہے۔ بندوں کی ہر ضرورت پوری کرتی ہے۔ ان کی کوتاہیوں اور سرکشیوں پر ایک دم پکڑ نہیں کرتی، سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت اور موقع دیتی ہے بلکہ

سمجھنے اور سنبھلنے کے انتظامات کرتی ہے۔

"قرآن عزیز و رحیم کا نازل کیا ہوا ہے" اس آیت سے مسلمانوں کو تو یہ اطمینان اور حوصلہ دینا مقصود ہے کہ تم اطمینان اور جرأت کے ساتھ حق پر چلتے رہو اور حق پیش کرتے رہو یہ "عزیز" کا پیغام ہے کسی کی مجال نہیں جو اس سے ٹکرا سکے۔ تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ آخر کار حق ہی غالب رہے گا اور باطل سرنگوں ہو کر رہے گا۔

رہا تمہارا یہ وسوسہ کہ خدائے عزیز یکایک ان گستاخ ظالموں کو تہس نہس کیوں نہیں کر دیتا تو اس سلسلہ میں یہ بات نگاہ میں رکھنی چاہئے کہ خدائے عزیز کی صفت رحیم بھی ہے وہ اپنی رحمت اور مہربانی سے اپنے بندوں کو مہلت دیتا ہے، کہ شاید یہ سمجھ لیں اور اپنی روش درست کر لیں۔ خدا کے رسول اور اس کی دعوت کے ساتھ بدترین سلوک کرنے کے بعد اگر یہ یونہی دندنا رہے ہیں تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ یہ خدا کی گرفت سے باہر ہیں، اور ایسے زور آور ہیں کہ جو چاہیں کرتے رہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدائے رحیم نے انھیں مہلت دے رکھی ہے کہ شاید انھیں ہوش آجائے۔

اور منکرینِ رسالت کو خدا کی یہ دو صفتیں یاد دلا کر جھنجھوڑا بھی گیا ہے کہ تم سخت غلطی پر ہو، اور انھیں متوجہ کرنے اور ترغیب دینے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ عزیز کی صفت یاد دلا کر ان سے کہا گیا ہے کہ جس دعوت کو دبانے اور مٹانے کی تم کوشش کر رہے ہو وہ اس خدا کی دعوت ہے جو عزیز ہے تو کیا تم اس عزیز سے مقابلہ کرنے کی جرأت کر رہے جو سب پر غالب ہے! جس کے سامنے تم بالکل بے بس، مجبور اور مغلوب ہو جس کی پکڑ سے تم کسی وقت باہر نہیں ہو۔ اس گستاخی اور ڈھٹائی کا انجام سوچ لو انتہائی بھیانک ہے۔

"رحیم"، کی صفت یاد دلا کر ان سے کہا گیا کہ تمہیں جو ڈھیل ملی ہوئی ہے یہ دراصل خدا کی رحمت ہے۔ وہ اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں کو اپنی روش پر غور کرنے اور سنبھلنے کا پورا موقع دیتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ بندے اس مہلت سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ خدا کی رحمت ہی ہے کہ اس نے تمہیں سمجھانے، خبردار کرنے اور انجام بد سے ڈرانے کے لئے رسول بھیجا، رسولؐ کا انذار کرنا اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے۔ اس لئے رحیم کے بعد اگلی آیت کا فقرہ ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا۔ تاکہ آپ قوم کو انذار کریں اور انجامِ بد سے ڈرائیں۔

دعوت و تفہیم کا یہ نرم گرم انداز اس قدر دلنشیں اور حکیمانہ ہے کہ جس دل میں خیر پسندی کا معمولی سا بھی جذبہ ہو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا مگر جس بد نصیب نے یہ طے ہی کر لیا ہو کہ مان کر نہیں دینا ہے اس کے لئے یہ تنبیہ و تذکیر اور تفہیم و ترغیب بے سود ہے۔

ے۶ اس آیت کے پہلے لفظ "لِتُنْذِرَ" کا تعلق تَنْزِیْلُ سے ہے اور پچھلی آیت میں مذکور خدا کی صفت "رحیم" کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی یہ کتاب رحیم کی نازل کی ہوئی ہے اور اس کی رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ آپ اپنی قوم میں دعوت و انذار کا فریضہ انجام دیں، کسی قوم میں انذار و دعوت کے لئے نذیر کو بھیجنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس قوم کی غفلت و جہالت اور گری ہوئی حالت پر خدا کی رحمت کو جوش آگیا ہے۔

"تاکہ آپ ڈرائیں" ڈرانے اور انذار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ انھیں یقین اور خیر خواہی کے پیغمبرانہ جذبے کے ساتھ بتائیں کہ کتاب اور رسولؐ کی تکذیب کرنے والوں کا انجام دنیا میں بھی ذلّت اور رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کو اس جرم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ے۷ "جن کے آباواجداد کو نہیں ڈرایا گیا" اس سے مراد اہلِ عرب کے وہ آباواجداد ہیں جو قریبی دور میں گزرے ہیں، اس لئے کہ زمانۂ بعید میں تو سرزمینِ عرب میں متعدد انبیا آچکے تھے۔ قرآن پاک میں یہ بات کئی جگہ کہی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ قصص آیت ۴۶ میں ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰھُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ "تاکہ آپ ڈرائیں ایک ایسی قوم کو جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔

سورہ سبا آیت ۴۴ میں ہے وَمَآ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ كُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَھَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْھِمْ مِّنْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِیْرٍ۔ اور ہم نے ان کو نہ کوئی کتاب دی جس کو یہ پڑھتے ہوں، اور نہ آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا۔

مگر یہ بات بتا کر قرآن محض تاریخ نہیں بیان کر رہا ہے۔ اس لئے کہ تاریخ بیان کرنا قرآن کا موضوع نہیں ہے۔ قرآن کا موضوع دعوت و تذکیر ہے، اور وہ جو کچھ بھی بیان کرتا ہے اسی نقطۂ نظر سے بیان کرتا ہے۔

اس واقعہ سے دراصل ان کی شرافت اور انسانیت کی حِس کو بیدار کرنا، اور ان کے دِل کو ہاتھ میں لینا بھی مقصود ہے، اور نہایت حکمت کے ساتھ انھیں ترغیب بھی ہے کہ یہ وہی نعمت تو ہے جس کے لئے تم اظہارِ تمنا کیا کرتے تھے۔ تمہیں تو پیش قدمی کرنی تھی، یہ تکذیب و انکار کی روش تم نے کیسے اختیار کرلی! اور سوچو کل خدا کے حضور تمہارے پاس کیا عذر ہوگا؟

"جن کے آباواجداد کو نہیں ڈرایا گیا" کہہ کر دراصل یہ کہنا ہے کہ عرصہ دراز سے تم آسمانی ہدایت سے محروم تھے، تم غفلت اور جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ تم آسمانی ہدایت کے انتہائی ضرورتمند تھے خدا کو تمہاری حالت پر رحم آیا، اس نے تمہاری ضرورت کا بہترین بندوبست کیا، کتاب نازل کی، شفیق و رحیم نبیؐ کو بھیجا، تاکہ وہ تمہیں

لَقَدۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ عَلٰۤی اَکۡثَرِهِمۡ فَهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷﴾ اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ

ان میں سے اکثر لوگوں کے بارے میں خدا کا فیصلۂ عذاب ہو چکا ہے؎ اب یہ

ایمان نہیں لائیں گے۹؎ ہم نے ان کی گردنوں میں

اس غفلت و جہالت سے نکالے، ہدایت و سعادت کی بلند شاہراہ پر لائے۔ سوچو، تمہیں اس رحمت و رافت اور سوز و خیرخواہی کے پیکر کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ اور تم کیا کر رہے ہو؟ پھر ضمنی طور پر خدا نے اپنے رسول سے یہ بھی کہا کہ آپ کی یہ قوم جو عرصے سے آسمانی ہدایت سے محرومی کے باعث غفلت میں پڑی تھی خدا نے ان کی ہدایت کے لئے آپ کو مامور فرما کر ان پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے ہیں لہذا آپ بھی ان کے لئے سراپا سوز و رحمت بن کر ان کو خبردار کریں اور ان کا دل ہاتھ میں لے کر ان تک وہ حق پہنچائیں جس کے یہ نہایت ضرورتمند ہیں۔

ترغیب کا پہلو یہ ہے کہ اہلِ عرب کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس آسمانی کتاب آتی اور ہماری جانب کوئی نبی بھیجا جاتا، تو ہم دوسروں سے کہیں زیادہ آگے بڑھ کر اس کی پیروی کرتے اور ہدایت پانے میں دوسروں سے کہیں زیادہ آگے ہوتے۔ ان سے کہا گیا کہ خدا نے اپنی کتاب بھی بھیج دی اور اپنا رسول بھی بھیج دیا۔ اب تمہارا کام یہی ہے کہ ہدایت کے اس سرچشمے کی طرف بے تابی سے آؤ، تمہارے لئے کسی طرح یہ سزاوار نہیں کہ تم اس کی مخالفت کرو۔ پھر یہ بھی سوچو کہ کل خدا کے حضور پیش کرتے کے لئے تمہارے پاس کیا عذر ہوگا۔ سورۃ انعام آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷ پر بھی ایک نظر ڈالئے "اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں (یعنی یہود و نصاریٰ) کو دی گئی تھی اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے ہیں اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن اور ہدایت و رحمت آگئی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔

؎ "القول" یعنی خدا کا قول، اور اس سے مراد خدا کا وہ فیصلۂ عذاب ہے جس کو قرآن میں دوسرے مقامات پر قولِ رب، کلمۂ رب اور کلمۂ عذاب بھی کہا گیا ہے، جیسا کہ آگے ان آیتوں سے معلوم ہوگا جو وضاحت میں پیش کی جائیں گی۔

"خدا کا فیصلۂ عذاب" دل کو ہلا دینے والے یہ الفاظ ایسے نہیں ہیں کہ آدمی ان پر سرسری نگاہ ڈال کر

یونہی لاپروائی سے گزر جائے۔ یہ رُک کر سنجیدگی سے غور کرنے اور سبق لینے کے الفاظ ہیں۔ خدا کی پناہ! جس فرد یا گروہ کے حق میں خدا فیصلۂ عذاب سنادے، اس کے لئے خیر کی پھر کیا امید! اس کے لئے تو دونوں جہاں میں ذلّت ہی ذلّت اور اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ خدا کا یہ سنگین فیصلہ کن لوگوں کے بارے میں ہوتا ہے یہ سنجیدگی سے غور کرنے کی بات ہے۔ اس مفہوم کی تمام آیتوں کو سامنے رکھنے کے بعد نہایت واضح انداز میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ یونہی اللٹپ نہیں ہوتا، وہ علیم وحکیم ہے، کسی کو یونہی بے قصور عذاب کا مستحق نہیں بناتا۔ اس کا یہ فیصلہ انہی نافرمانوں کے لئے ہوتا ہے جو اپنی مسلسل نافرمانیوں سے اپنے کو اس کا مستحق بنا لیتے ہیں۔

خدا کی مرضی یہی ہے کہ اس کے بندے حق کو قبول کریں حق پر چلیں اور حق کے حامی بن کر رہیں، لیکن وہ اپنی مرضی کسی پر مسلّط نہیں کرتا، وہ کسی کو حق قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ یہ بات کائنات کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ دنیا آزمائش کے لئے پیدا کی گئی ہے یہاں ہر فرد اور ہر گروہ کو آزمایا جاتا ہے، خدا اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے کتاب نازل فرماتا ہے، رسول اور اس کے پاکیزہ ساتھی، خدا کی مرضی میں ڈھل کر اپنی عملی زندگی سے حق کو عملی شکل میں پیش کرتے ہیں، حق کھول کھول کر بیان کرتے سمجھانے اور دل میں اُتارنے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ پھر بھی انکار، استکبار، نافرمانی، سرکشی، ڈھٹائی، ہٹ دھرمی اور حق دشمنی کی روش پر ہی جمے رہتے ہیں، حق کو دیکھنے سُننے اور سمجھنے کی صلاحیتیں بالکل ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ اثر لینے اور حق قبول کرنے کی استعداد سے بالکل ہی خود کو محروم کر لیتے ہیں اور اپنی مسلسل نافرمانی اور حق دشمنی اور حق بیزاری سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ کسی طور حق کو مان کر نہیں دیں گے۔ تو ان کے یہ کرتوت انھیں فیصلۂ عذاب کا مستحق بنا دیتے ہیں، اور خدا کی طرف سے ان پر فیصلۂ عذاب چسپاں ہو جاتا ہے، علم وحکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ہدایت کی توفیق ان سے چھین لی جائے۔ ان کی شامتِ اعمال ان پر مسلّط کی جائے۔ اُن کو ایسا رسوا کن عذاب دیا جائے کہ اُن پر نہ آسمان روئے نہ زمین اور پھر یہ آخرت کے عذاب میں ہمیشہ تڑپتے رہیں۔

سورۂ نمل آیت ۸۵ میں ہے۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا — ان پر عذاب کا فیصلہ ہو گیا ان کے مسلسل ظلم کی وجہ سے

سورۂ اسراء آیت ۱۶ میں ہے۔

فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا — پس اس پر فیصلۂ عذاب چسپاں ہو گیا اور ہم نے

تَدۡمِيۡرًا ۝ — انھیں تہس نہس کر دیا۔

سورہ صفّٰت آیت ۳۱ میں ہے۔

فَحَقَّ عَلَيۡنَا قَوۡلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوۡنَ ۝ — آخر ہم اپنے رب کے فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو گئے اب ہمیں عذاب کا مزہ چکھنا ہی ہے۔

سورہ یونس آیت ۹۶، ۹۷ میں ہے

اِنَّ الَّذِيۡنَ حَقَّتۡ عَلَيۡهِمۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ وَلَوۡ جَآءَتۡهُمۡ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ۝ — واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں پر آپ کے رب کا فیصلہ چسپاں ہو گیا وہ ایمان لا کر نہیں دیں گے خواہ ان کے سامنے ساری ہی نشانیاں آجائیں جب تک وہ اپنی آنکھوں سے دردناک عذاب آتا نہ دیکھ لیں۔

سورہ زمر آیت ۱۹ میں اسی فیصلۂ عذاب کو کلمۃ العذاب کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس بدنصیب کے بارے میں یہ فیصلہ ہو گیا۔ پھر اس کے چھٹکارے کی کوئی شکل نہیں۔

اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَيۡهِ كَلِمَةُ الۡعَذَابِ ؕ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِى النَّارِ ۝ — کیا اس شخص کو کوئی بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو کیا آپ اُسے بچا سکتے ہیں جو آگ میں گر چکا ہو۔

خدا کی طرف سے یہ فیصلہ یکایک نہیں ہوتا، وہ سمجھنے سنبھلنے اور اصلاح حال کرنے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ اور جب روحانی زندگی کے آثار بالکل ہی ناپید ہو جاتے ہیں، قلب و روح میں اثر پذیری کی استعداد بالکل ہی مُردہ ہو جاتی ہے اور زمین کی پیٹھ پر چلنے پھرنے والا انسان جب روحانی زندگی سے بالکل ہی محروم ہو کر مُردہ لاشہ بن جاتا ہے، تو فیصلۂ عذاب اس کا مقدّر بن جاتا ہے۔

اسی سورہ یٰسٓ کی آیت ۷۰ میں ہے۔

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ وَّقُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ ۝ لِّيُنۡذِرَ مَنۡ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۝ — یہ تو ایک یاد دہانی اور واضح کتاب ہے، تاکہ آپ اس کے ذریعے اس کو خبردار کریں جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر خدا کی حجت قائم ہو جائے۔

"جو زندہ ہو" یعنی سوچنے سمجھنے اور اثر لینے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کے قلب میں حق کو قبول کرنے کی استعداد باقی ہو۔ دراصل اس آیت میں اُن مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے جو مکّے کے انتہائی سخت حالات میں اسلام لا کر نبیؐ کے ساتھ دعوتِ حق کا کام کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ خدا کے رسولؐ انتہائی اخلاص خیر خواہی، دردمندی دل سوزی

اور بے لوثی کے ساتھ خدا کا پیغام پیش کر رہے ہیں، خدا کی آیتیں سنا رہے ہیں، لیکن کفارِ مکہ کی سرکشی اور حق دشمنی میں کمی کیا معنی روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے اور وہ کسی طرح حق ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔

اس صورتِ حال سے قدرتی طور پر مسلمان متاثر ہو سکتے تھے، ان کو وساوس گھیر سکتے تھے، اس لئے ان کی تسلی اور اطمینانِ قلب کے لئے ان سے کہا گیا کہ ان مخالفین کی اکثریت اپنی مسلسل نافرمانی اور تکذیب سے اپنے کو خدا کے فیصلۂ عذاب کا مستحق بنا چکی ہے۔ خدا کے رسولؐ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ یقیناً حق ہے، اور یہ بھی سورج سے زیادہ روشن حقیقت ہے کہ رسول پاکؐ جس سوز و گداز اور اخلاص و بے لوثی کے ساتھ دعوت پیش کر رہے ہیں اس کی کوئی نظیر اور مثال روئے زمین پر نہیں مل سکتی لیکن جن بدنصیبوں نے یہ طے ہی کر لیا ہو کہ مان کر نہیں دینا ہے۔ انھیں ایمان کی توفیق کیونکر نصیب ہو سکتی ہے۔

ایک بات اور نگاہ میں رکھنی چاہیئے کہ قرآن پاک نے اس فیصلۂ عذاب کا ذکر جن جن مقامات پر بھی کیا ہے، خواہ وہ دورِ سعادت کے منکرینِ رسالت کے بارے میں ہو یا انبیاء سابقین کے مخالفین کے بارے میں۔ یہ ذکر کسی جگہ بھی محض ایک تاریخی داستان سنانے کے طور پر نہیں کیا گیا ہے بلکہ تذکیر و عبرت کے لئے ایک اصولی اور دائمی حقیقت کے طور پر کیا گیا ہے، یہ فیصلہ ماضی میں بھی ہوا ہے آج بھی ہوگا اور آئندہ بھی ہوگا اس طرح کے کردار بھی ہر دور میں پائے جاتے رہیں گے، اور ان کے حق میں خدا کا فیصلۂ عذاب بھی ہوتا رہے گا۔ کوئی فرد یا گروہ اپنے کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر کے جھوٹا اطمینان نہ محسوس کرے کہ یہ ماضی کی سرگزشت تھی جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ——— جی نہیں حق و باطل کی یہ کشمکش اس وقت تک رہے گی جب تک یہ دنیا قائم ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کب کس فرد یا قوم کے بارے میں خدا کا فیصلۂ عذاب ہو جائے۔ کب وہ ہدایت کی توفیق سے محروم کر دیا جائے اور دونوں جہاں کی تباہی اور رسوائی اس کے لیے مقدر بن جائے ———

۹ "یہ ایمان نہیں لائیں گے" یہ ان اکثر لوگوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے، جن کے لیے خدا کا فیصلۂ عذاب صادر ہو چکا ہے۔ خدا کے فیصلۂ عذاب ہو جانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان سے توفیقِ ایمان اور قبولِ حق کی استعداد چھین لی گئی ہے۔ رسول کی تکذیب و انکار اور عداوت و استکبار نے ان پر ہدایت کی راہ بند کر دی ہے۔ اب یہ اسی طرح گمراہی میں بھٹکتے رہیں گے۔ ان کی ضد اہٹ دھرمی اور مخالفت سے نہ تم دل شکستہ ہو، نہ ان کے پیچھے پڑو، ان کی حق سے بیزاری کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہاری طرف سے پیش کیے جانے والے حق میں کوئی کھوٹ ہے، کھوٹ دراصل ان کے اندر ہے۔ یہ طے کر چکے ہیں کہ مان کر نہیں دیں گے اور خدا نے بھی اپنی حکمت کے تحت ان کیلئے یہی فیصلہ فرما دیا ہے

أَغْلٰلًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ۝٨ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝٩

طوق ڈال دیے ہیں[۱۰]، جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے ہوتے ہیں، اس لئے وہ سر اُٹھائے کھڑے ہیں[۱۱] اور ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے ہم نے انھیں ڈھانک دیا ہے اب انھیں کچھ نہیں سوجھتا[۱۲]

---

۱۰ "ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں"، خدا نے طوق ڈالنے کی نسبت اپنی ذات کی طرف اس لیے کی ہے کہ سب کچھ خدا ہی کے حکم سے ہوتا ہے، لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کا ہر کام حکمت و علم پر مبنی ہوتا ہے یہ ان بدنصیبوں کی اپنی مسلسل نافرمانی اور ہٹ دھرمی ہی ہے جو طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اور اس نے ٹھوڑیوں تک ان کی گردنوں کو جکڑ لیا ہے۔ خدا اپنے بندوں کے حق میں وہی فیصلہ فرماتا ہے جس کے وہ اپنے کرتوتوں کے باعث مستحق ہوتے ہیں، سورہ تطفیف میں اس حقیقت کی وضاحت اس انداز میں کی گئی ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ — ہر گز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے بُرے کرتوتوں کا رنگ چڑھ گیا ہے جو یہ کرتے رہے ہیں۔

۱۱ "سر اُٹھائے کھڑے ہیں" یعنی طوق نے ٹھوڑی تک ان کی گردن کو اس طرح جکڑ لیا ہے کہ ان کا سر اوپر کو اٹھا ہوا ہے اور طوق کی تنگی اور تکلیف سے ان کی آنکھیں مچی ہوئی ہیں، اونٹ جب پانی پی کر سر اوپر کو اٹھاتا ہے تو اسے قموح کہتے ہیں، اور جب طوق کی تنگی اور تکلیف سے قیدی کا سر اوپر ہی کو اٹھا رہے تو کہتے ہیں اَقْمَحَ الْغُلُّ الْاَسِیْرَ طوق نے قیدی کے سر کو اوپر اٹھا ہوا کر دیا ہے۔

در اصل ان الفاظ کے ذریعے ان حق بیزاروں کی عبرتناک تصویر پیش کر کے ان کے قلب و روح کی اس گھناؤنی کیفیت کو محسوس کرایا گیا ہے جس میں یہ لوگ اپنی پیہم نافرمانی اور حق بیزاری کی وجہ سے مبتلا کر دئے گئے ہیں، کبر و غرور کے طوق نے بُری طرح اُن کی گردنوں کو جکڑ لیا ہے، ان کے سر اوپر کو اُٹھے ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں مچی ہوئی ہیں، اب روشن سے روشن حقیقت بھی ان کے سامنے آجائے، تو یہ اس کی طرف توجہ نہیں کر سکتے، ان کی آنکھیں حق کو دیکھنے سے معذور کر دی گئی ہیں، ان کے سر حق کے آگے جھکنے کی توفیق سے محروم کر دئے گئے اور ہدایت سے محرومی اور حق سے بیزاری کی یہ عبرتناک کیفیت اب ان کا مقدر بن چکی ہے۔

۱۲ دیوار سے مراد وہ غیر محسوس ذہنی اور قلبی روک ہے جو خدا نے ان دشمنانِ رسول کے اور قبول حق کے درمیان

وَسَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ⑩

ان کے لئے یکساں ہے، آپ انھیں انذار کریں یا نہ کریں یہ ایمان نہیں لائیں گے [۱۳]

کھڑی کر دی ہے۔ اب نہ یہ لوگ حق کو دیکھ سکتے ہیں، نہ سُن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس سے اثر لے سکتے ہیں، آگے دیوار کھڑی کرنے سے مراد یہ ہے کہ اب یہ اپنے انجام کے نتائج اور آخرت کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں سوچ سکتے، آخرت کی زندگی اب ان کی سمجھ میں قطعاً نہیں آسکتی، ان کے دلوں میں خدا کے سامنے پیشی کا خوف ہرگز جگہ نہیں پا سکتا، یہ موجودہ عیش و لذت پر ایسے فریفتہ ہیں کہ عاقبت کا خیال بھی انھیں نہیں آتا۔ پیچھے دیوار کھڑی کرنے سے مراد یہ ہے کہ ماضی کی تاریخ سے بھی یہ کوئی سبق نہیں لے سکتے، رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کی عبرت انگیز تاریخ ان کے سامنے ہے، ان کی تباہ شدہ بستیاں اور کھنڈرات ان کے آس پاس موجود ہیں، ان کی جہالت، تعصب عناد اور لذت پرستی نے ان کو بالکل اندھا کر دیا ہے۔ ان کی آنکھوں پر خدا نے پردے ڈال دئے ہیں ان کی آنکھیں ہیں مگر عبرت کی نگاہ سے محروم، ان کے کان ہیں مگر حق کو سننے سے معذور، ان کے دل ہیں، مگر سمجھنے اور اثر لینے کی توفیق سے خالی ماضی کی تاریخ سے سبق لینے کی استعداد یہ بالکل کھو چکے ہیں۔ خدا کا فیصلہ عذاب جن مجرموں کے بارے میں صادر ہو جاتا ہے، وہ گمراہی کے ایسے اندھیرے میں پھنس جاتے ہیں جس سے نکلنا پھر کبھی ان کو نصیب نہیں ہوتا۔

[۱۳] کفر و استکبار کی روش پر اڑے رہنے والوں کے لئے آخر کار خدا کی طرف سے گمراہی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد ان کے لئے دعوت و انذار، تذکیر و تبلیغ بالکل بے سود ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر ان کے مسلسل کفر و انکار سے ایسے غلاف چڑھ جاتے ہیں کہ نہ ان کے اندر کا بغض و عناد باہر نکل پاتا ہے اور نہ باہر سے حق کی روشنی ان میں داخل ہو پاتی ہے۔ ان کے سوچنے سمجھنے، اثر لینے اور عبرت حاصل کرنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ انہی لوگوں کے بارے میں سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ‌ؕ وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝

"جو لوگ کفر کی روش پر اڑے ہوئے ہیں ان کے لئے یکساں ہے، خواہ تم انھیں انجام بد سے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے۔"

دل اور کانوں پر مُہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈال دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کو ان قوتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب قوتیں ان کے پاس ہوتی ہیں مگر ان سے یہ حق شناسی اور حق پذیری کا کام نہیں لیتے۔ ان کی آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان میں وہ نور نہیں رہتا جس سے یہ حق کو دیکھ سکیں، ان کے کان موجود ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں رہتی کہ وہ حق کو سن سکیں، ان کے سینوں میں دل دھڑکتے ہیں، لیکن ان میں یہ استعداد نہیں رہتی کہ وہ حق کو سمجھ سکیں اور قبول کر سکیں۔ یہ اپنی ان قوتوں سے اتنا ہی کام لیتے ہیں جتنا کام جانور لیتے ہیں، مگر یہ جانوروں سے زیادہ بدتر ہوتے ہیں، اس لئے کہ جانوروں کو اپنی قوتوں سے اتنا ہی کام لینے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ مگر ان کو تو اپنی قوتوں سے وہ کام لینا تھا جس کی طرف خدا کے پیغمبر اور خدا کا قرآن انھیں متوجہ کر رہا ہے۔ ان کی اس کیفیت کو قرآن نے سورۂ اعراف آیت ۱۷۹ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝

"ان کے پاس دل ہیں مگر یہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر یہ ان سے دیکھتے نہیں ان کے پاس کان ہیں مگر یہ ان سے سنتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔"

جس کے بارے میں خدا ہی گمراہی کا فیصلہ فرما دے اور جس کے لئے خدا ہی ہدایت سے محرومی مقدر کر دے اسے پھر ہدایت کیسے نصیب ہو سکتی ہے فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ "خدا کے بعد پھر اسے کون ہدایت دے سکتا ہے۔"

مکے میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو ان گمراہ قسمت مخالفین کی یہ کیفیت بتانے کا مقصود یہ ہے کہ وہ ان کے کفر کی روش پر اڑے رہنے سے دل شکستہ نہ ہوں، اور دعوت و تبلیغ کے دوران جب ان لوگوں سے سابقہ پڑے اور ان کے انکار و استکبار کی یہ کیفیت سامنے آئے تو پھر ہرگز ان کے پیچھے نہ پڑیں، حق ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا، یہ اسی کو نصیب ہوتا ہے جس کے دل میں اس کی طلب اور تڑپ ہوتی ہے۔ مگر یہ سعید روحیں بھی چونکہ انھیں میں پھیلی ہوتی ہیں، اس لئے داعیانِ حق کو عام دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہنا ہے، ان مخالفین کی حق بیزاری کے اظہار کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے مایوس اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہیں بلکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ ان کے پیچھے وقت ضائع کرنے کے بجائے ان سعید روحوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قافلۂ حق میں شامل کرتے جائیں جن کے دل حق کے لئے کھلے ہوتے ہیں، مگر یہ حق پرست چونکہ اسی بستی میں اور انہی خاندانوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور داعیانِ حق کو متعین طور پر کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں

إِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۱﴾

آپ تو اسی شخص کو انذار[۱۴] کر سکتے ہیں جو اس ذکر[۱۵] کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے[۱۶]، تو اسے مغفرت[۱۷] اور اجرِ کریم کی بشارت دے دیجئے

اس لئے انھیں عام دعوت و تبلیغ کا کام پورے نشاط اور جذبے کے ساتھ کرتے رہنا چاہئیے۔ حق کی کشش انشاء اللہ انھیں خود کھینچ لائے گی

[۱۴] انذار قرآن پاک کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اور رسول کا ایک منصبی فریضہ ہے، عام طور پر اردو میں لوگ اس کا ترجمہ کرتے ہیں، ڈرانا، خبردار کرنا، نصیحت کرنا، تنبیہ کرنا وغیرہ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک لفظ سے بھی انذار کے پورے مفہوم کی وضاحت کا حق ادا نہیں ہوتا۔

جب کوئی قوم اپنی غفلت، سرکشی، جہالت اور معصیت میں ڈوب کر بالکل ہی اپنے رب سے غافل ہو جاتی ہے، تو پروردگار کی رحمت جوش میں آتی ہے اور وہ ان میں اپنا رسول مبعوث فرماتا ہے رسول ان سب کو خطاب کرتا ہے اور سوز و یقین، اخلاص و خیر خواہی اور احساسِ فرض کی بے مثال کیفیت کے ساتھ ان سب کو خبردار کرتا ہے کہ تمہاری اس گھناؤنی اور باغیانہ زندگی کا انجام انتہائی بھیانک ہے، تمہاری اس سرکشی کے نتیجے میں خدا کا ہولناک عذاب تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے، باز آجاؤ اس جہالت اور نافرمانی کی زندگی سے، اپنے پیدا کرنے والے اور پرورش کرنے والے خالق و مالک ہی کی بندگی کرو، صرف اسی سے ڈرو اور میری پیروی میں صرف اسی کی ہدایت پر چلو، خدا تمہیں اپنے انعامات سے نوازے گا اس تنبیہ و تذکیر، دعوت و نصیحت، یاددہانی اور آگاہی کے پورے عمل کا جامع نام انذار ہے۔ انذار کا یہ جامع مفہوم خود قرآن نے جگہ جگہ واضح کیا ہے۔ مثلاً سورہ نوح میں نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۙ میں تمہارے لئے کھلا نذیر بن کر آیا ہوں، اور پھر نذیر کا بیان اور وضاحت ان الفاظ میں کی ہے اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِیْعُوْنِ ۙ یعنی یہ کہ تم اللہ کی بندگی کرو، اسی سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

خدا کے رسولؐ یہ انذار، جس مؤثر، دلنشیں اور حکیمانہ پیرائے میں کرتے ہیں، کوئی دوسرا تو ان کی نقل

کا حق بھی ادا نہیں کر سکتا، اس لئے کہ رسول براہِ راست خدا کے ترجمان ہوتے ہیں، اور خدا خود ہی ان کو اس کام کے لئے تیار کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود نبی کا یہ انذار سب پر اثر انداز نہیں ہوتا، اس سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھاتے ہیں، جن میں فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو لوگ اپنی مسلسل نافرمانی، ہٹ دھرمی، اور تعصب سے اپنی یہ صلاحیت ضائع کر دیتے ہیں انھیں نبی کے انذار سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، قرآن کا یہ فقرہ "آپ تو اسی شخص کو انذار کر سکتے ہیں" اسی اصولی حقیقت کو بیان کر رہا ہے، اس فقرے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ تو صرف انہی لوگوں کو انذار کر رہے ہیں، یا کریں، جن کی دو خوبیاں آگے بیان ہو رہی ہیں۔ اس لئے کہ آپ تو سب کے لئے نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں، آپ کا انذار اور آپ کی دعوت سب کے لئے عام ہے، قرآن کے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے انذار سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھائیں گے جن میں فائدہ اٹھانے کا جوہر موجود ہے، انذار و دعوت سے زندگیوں میں صالح انقلاب آجانے کا دار و مدار صرف دعوت و انذار کی صحت و حکمت پر نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ کو مکے کی سرزمین میں کوئی ایک متنفس بھی منکرِ حق نظر نہ آتا اس لئے کہ آپ سے زیادہ ذمہ داری امانت اور حکمت سے پیغامِ حق پیش کرنے والا کون ہو سکتا ہے آپ جیسا داعی اور نذیر تو آسمان کی آنکھ نے آج تک نہ دیکھا ہے اور نہ قیامت تک دیکھنا ممکن ہے، در اصل دعوت و انذار سے فائدہ اٹھانے کا دار و مدار آدمی کی اپنی قلبی کیفیت، حق پرستی اور طلبِ ہدایت پر ہے، حق کی بارش سب پر یکساں ہوتی ہے، اب یہ دل کی زمین کی صلاحیت ہے کہ وہ اس سے سرسبز و گلزار بنتی ہے، یا جھاڑ جھنکاڑ اگاتی ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ‎ ‎ ‎ ‎ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

بارش کی لطافتِ طبع میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ سب جگہ یکساں برستی ہے مگر باغ میں اس سے خوش رنگ "لالہ" کے پھول کھلتے ہیں، اور بنجر زمین میں اس سے ناکارہ اور منحوس گھاس اُگتی ہے۔

۱۵؎ ذکر سے مراد قرآن پاک ہے، جیسا کہ اسی سورت کی آیت ۶۹ میں وضاحت ہے، اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ یہ تو صرف ذکر اور واضح قرآن ہے۔ ذکر کے لغوی معنی یاد دہانی کے ہیں، قرآن پاک کو ذکر، ذِکریٰ، تذکرہ جیسے ناموں سے اسی لئے پکارا گیا ہے، کہ یہ اُسی حق کی یاد دہانی کراتا ہے جو ہمیشہ سے خدا کے رسولوں کے ذریعہ انسانوں کے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے، اور اس لئے بھی کہ یہ اُس ازلی عہد کی یاد دہانی ہے جو آدم کی پوری ذریت نے اپنے خدا سے کیا تھا، جب خدا نے پوچھا تھا، "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" تو سب نے کہا تھا،

بلیٰ:۔ یعنی یہ کوئی اجنبی چیز نہیں ہے جس سے انسان کا ذہن اور فطرت نا آشنا ہو۔

۴۶ بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے" خدا سے ڈرنے کا مطلب ہے اس کے حضور حاضر ہونے اور آخرت میں جوابدہ ہونے سے ڈرنا، یعنی وہ ہولناک دن، جس کو اس نے دیکھا نہیں ہے، جس کے آنے کی خبر رسول نے دی ہے، یہ بے دیکھے اس دن سے ڈرتا ہے اور اس خوف سے لرزتے ہوئے زندگی گزارتا ہے کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے۔ سورہ انبیا آیت ۴۹ میں ہے، "اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ"، جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، غیب میں ہوتے ہوئے، اور آنے والی گھڑی قیامت سے ڈرنے والے ہیں۔

اس آیت میں انذار و دعوت سے فیضیاب ہونے والوں کی دو خوبیاں بیان کی گئیں ہیں۔ جذبۂ اطاعت اور خوفِ خدا، اوپر کی آیات میں اُن لوگوں کا ذکر تھا جو حق سے بیزار رہے اور انھوں نے نبی کی دعوت و انذار سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا، ان کی دو نمایاں خرابیاں یہ تھیں، کہ وہ غرور و استکبار میں مبتلا تھے، اور خدا سے بے خوف اور غافل تھے۔ ان کی یہ دونوں بنیادی بُرائیاں اور ان کے نتیجے میں ان کا رسولِ خدا کے ساتھ ناروا سلوک اور باغیانہ طرزِ عمل اس انداز سے بیان کیا گیا تھا، کہ یہ لوگ مشخص اور ممتاز ہوکر سامنے آجائیں اور پہچان لئے جائیں کہ یہ، ہیں وہ بدنصیب جن کے بارے میں خدا نے قطعی فیصلہ سنا دیا ہے "هُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ" یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔

اس کے مقابلے میں یہاں رسول کے متّبعین کی دو ایسی نمایاں خوبیاں بیان کی جارہی ہیں جن کے ذریعے مکّے کے باشندوں کے سامنے ان کو پیش کر کے بتایا جارہا ہے کہ دیکھو یہ ہیں وہ لوگ جن میں حق پرستی اور خدا ترسی کا جوہر موجود ہے، ان سنگین حالات میں حق پر جمنا، ہر طرح کے ظلم سہنا، ہر طرح کے دُکھ جھیلنا اور محض خدا کے حضور حاضری کے خوف سے اس کی ہدایت کی پیروی کرنا معمولی بات نہیں ہے، ان کی پاکیزہ زندگیاں ان کے بلند اخلاق و کردار ان کی دلکش شخصیتیں، حق کو اختیار کرنے ہی کا ثمرہ ہیں اور ان کو قبولِ حق کی یہ توفیق اسی لئے ملی ہے کہ ان کے اندر حق پرستی اور خوفِ خدا کا جوہر موجود ہے یہ گویا خدا کی طرف سے ان کے ایمان و اطاعت کا اعتراف ہے۔ اور خدا کے اس اعتراف نے اس مختصر گروہ میں جو عزیمت۔ جو حوصلہ اور جو شجاعت و جرارت پیدا کی۔ اور مختصر ترین مدّت میں ان سعید روحوں نے جو پاکیزہ انقلاب برپا کیا، نہ دنیا اس کی نظیر پیش کرسکتی ہے۔ اور نہ اس کی حیرت میں کوئی کمی آسکتی ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿۱۲﴾

ہم یقیناً مُردوں کو ایک روز زندہ کریں گے[۱۸] جو کچھ اعمال کرکے یہ آگے بھیج چکے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں اور جو کچھ کرکے یہ پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں[۱۹] اور ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں جمع کر رکھا ہے ۲۰

۱۷ مغفرت کے لغوی معنی ہیں۔ ڈھانکنا۔ چھپانا۔ "غفرۃ" کہتے ہیں سرپوش اور ڈھکنے کو، "الغفارہ" اس لمبی چوڑی چادر کو کہتے ہیں جو علمائے یہود اوڑھ کر اپنے پورے جسم کو ڈھانک لیتے ہیں۔ "مغفر" خود کو کہتے ہیں۔ جسے فوجی اوڑھ کر اپنا سر چھپا لیتے ہیں۔ یہی لفظ جب گناہوں کے لئے بولتے ہیں۔ تو اس کا مطلب ہوتا ہے۔ گناہوں کو معاف کر دینا اور چھپا دینا گناہوں کی معافی کے لئے مغفرت کا لفظ استعمال کرنے میں بڑی حکمت اور معنویت ہے۔ جس کا تصور کرکے روح مسرت و سرور سے جھوم اٹھتی ہے، انسان سے بے شمار گناہ ہوتے رہتے ہیں اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کسی کے سامنے اس کے گناہ نہ آئیں، اس رسوائی کو وہ ہرگز پسند نہیں کرتا۔ عدالت میں اس کے جرم سامنے آنے کے بعد اگر عدالت اسے معاف بھی کر دے تو بھی اس احساس کی تلخی اسے ہمیشہ شرمندہ رکھتی ہے کہ اتنے انسانوں کے سامنے رسوائی ہوئی۔ اور اتنے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ہے کہ اس شخص نے یہ یہ گھناؤنے جرم کئے ہیں۔ جب کہ دنیا کی اس عدالت میں چند ہی لوگ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے وہ لوگ موجود نہ بھی ہوں جن کی موجودگی کو مجرم کچھ زیادہ ہی محسوس کرتا ہے۔

اب آپ میدانِ حشر کا تصور کیجئے، حضرت آدم سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسان موجود ہوں گے۔ سارے پیغمبر اور خود رسول کریمؐ بھی ہوں گے۔ ماں۔ باپ۔ اولاد۔ احباب رشتہ دار سب ہی ہوں گے۔ اور وہاں کوئی اوٹ اور کوئی پردہ بھی نہ ہوگا۔ انسان کے وہ بہت سے گھناؤنے گناہ جن کی خبر صرف خدا ہی کو ہے۔ اگر قیامت کے دن سب کے سامنے لائے جائیں تو آدمی کی کیا کیفیت ہوگی۔ کتنی زبردست ہوگی یہ ذلت اور رسوائی۔ اس لئے مہربان خدا یہ نہیں کہتا کہ میں معاف کر دوں گا۔ بلکہ کہتا ہوں میں ان پر مغفرت کا پردہ ڈال دوں گا۔ ان کو چھپا دوں گا کہ کسی کی نگاہ ہی نہ پڑ سکے اور میرے بندے کی ذرا بھی بے عزتی اور رسوائی نہ ہو۔ بے عزتی اور رسوائی کیا معنی ــ خدا انہیں اجرِ کریم عطا کرے گا۔ جس سے ان کی عظمت، کرامت، اور عزت میں ایسا اضافہ ہوگا۔ جس کا آج یہ صحیح صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے۔

۱۸ اوپر دو گروہوں کا کردار بیان کیا گیا تھا، ایک وہ سنگدل اور خدا فراموش گروہ ہے، جو غرور د

استکبار میں بدمست ہے۔ دوسرا وہ خداشناس اور متواضع گروہ ہے جس کے دل میں خدا کی خشیت ہے۔ اس کے بعد کہا گیا" ہم یقیناً مُردوں کو زندہ کریں گے"، اس فقرے میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی خشیت اور نیک دلی کا سبب یہی یقین ہے۔ ان کی زندگیوں میں خوشگوار انقلاب اور کردار میں کشش دراصل اسی انقلابی یقین اور پختہ عقیدے کا پیدا کردہ ہے۔ اور دوسرا گروہ گھناؤنے اعمال میں اسی لئے مبتلا ہے کہ وہ اس یقین اور تصوّر سے محروم ہے۔ نبیؐ اسی یقین اور عقیدے کی دعوت تو دے رہے ہیں، ایک گروہ اس دعوت پر ایمان لے آیا، اور ایک گروہ انکار پر اڑا رہا۔ دونوں کا کردار اور دونوں کی زندگیاں سامنے ہیں، ایک گروہ نرمی، رحمدلی، خداترسی شرافت اور عاقبت اندیشی جیسی خوبیوں سے آراستہ ہے، اور دوسرے گروہ کے دل پتھر سے زیادہ سخت اور ویرانے سے زیادہ اُجاڑ ہیں، دو کرداروں کا یہ عظیم فرق اور انتہائی فاصلہ ایسا تو نہیں ہے کہ عقل و نگاہ رکھنے والا انسان آسانی سے اس کو نظرانداز کر سکے۔ اور وہ ذرا بھی رُک کر نہ سوچے کہ آخر انسان اور انسان میں یہ فرق کیوں اور کیسے پیدا ہو گیا۔ عقل و تمیز کی کوئی ادنیٰ رمق بھی اگر آدمی میں موجود ہو تو یہ روزِ روشن سے زیادہ روشن حقیقت اس کی نگاہ کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

پھر یقین کی پوری قوت اور زور کے ساتھ یہ بات کہہ کر منکرین حق کو نہایت حکمت کے ساتھ لطیف انداز میں یہ تنبیہ اور تذکیر بھی کی گئی ہے کہ نادانو! مرنے کے بعد دوبارہ زندگی تو ایک حقیقت ہے، تمہارے انکار اور مخالفت سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہ دن ٹل جائے، اور تم خدا کے حضور پیشی سے بچ جاؤ۔ حقیقت کا انکار کرنے سے حقیقت تو نہیں بدلتی یہ دن تو لازماً آنا ہے۔ اور ہر انسان کا اگلا پچھلا کیا کرایا سب سامنے آنا ہے ہر ایک کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔ اور یہ ریکارڈ وقت آنے پر یقیناً سُنایا جائے گا۔ اس حقیقت سے غفلت یا انکار کر کے آدمی اپنی ہی عاقبت خراب کرے گا۔ اس کی غفلت اور انکار سے حقیقت پر کوئی آنچ نہیں آسکتی آخرت کی زندگی ایک اٹل حقیقت ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ ایک روز مُردوں کو زندہ کرے گا۔ انسان جو کچھ کر رہا ہے، اور جو آثار اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہے، وہ سب دفترِ عمل میں محفوظ ہو رہے ہیں، اور یقیناً ایک روز یہ دفترِ عمل انسان کے سامنے رکھ کر اس سے کہا جائے گا۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ (بنی اسرائیل)	پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج اپنا حساب لگانے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔

۱۹ انسان کا جو نامۂ عمل "کل" پیش ہونے کے لئے تیار ہو رہا ہے، اس میں دو قسم کے اعمال درج ہو رہے ہیں،

اور ان دونوں کی سزا یا صلہ انسان کو ملنے والا ہے۔

انسان کے ایک اعمال تو وہ ہیں، جو اُس نے خود کئے اور کر کے اپنے آگے آگے آخرت میں پیش ہونے کے لئے بھیج دئے۔ دوسرے وہ اعمال و آثار ہیں جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے۔ اور جب تک وہ آثار اور اثرات باقی رہیں گے ان کے اچھے یا بُرے نتائج اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے رہیں گے۔ پہلے قسم کے اعمال کے لئے قرآن "قدم" یا "قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُم" کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور دوسرے قسم کے اعمال کیلئے "اخّر" اور "آثار" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ ان دونوں قسم کے اعمال کا ذکر کیا ہے اور متوجہ کیا ہے کہ جسے عاقبت عزیز ہے اُسے دونوں قسم کے اعمال پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ سورۂ قیامہ آیت ۱۳ میں ہے۔

يُنَبَّؤُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ — اس دن انسان کو سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا

سورۂ انفطار آیت ۵ میں ہے

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ — اس دن ہر شخص کو اپنا اگلا پچھلا کیا دھرا سب معلوم ہو جائے گا

جن اعمال کو قرآن آگے بھیجے گئے اعمال کہتا ہے ان سے مراد وہ سارے افعال، حرکات اور اقوال ہیں، جو آدمی نے اپنے ہاتھ پیر، آنکھ، کان، دل، زبان، ذہن و دماغ اور دوسری صلاحیتوں سے انجام دئے ہیں اور خدا کے یہاں اس کے دفترِ عمل میں لکھ گئے ہیں، قیامت کے روز یہ سارے اعمال اپنی تفصیلات کے ساتھ سامنے آجائیں گے، وہ ساری کیفیات اور منظر بھی سامنے ہوں گے جن کیفیات اور جس منظر میں یہ انجام دئے گئے تھے۔ انسان کی اپنی آواز، اپنے ارادے، اپنی نیتیں اپنے جذبات و خیالات اس کے ذہن و قلب کی تختی پر نمایاں محسوس ہوں گے۔ اس کی اچھی بُری ساری باتیں اور تمام حرکات و سکنات اپنی اصل شکل میں سامنے آجائیں گی۔ اور آدمی کی زبان، آنکھیں اور پورا جسم ہر چیز گواہی دے گی۔ جس ماحول اور جس زمین کے حصے پر جو حرکت کی گئی ہے، وہ حصۂ زمین اور وہ ماحول بھی گواہی دے گا بلکہ ہر وہ چیز گواہی دینے کے لئے بول اُٹھے گی جس کے سامنے انسان نے کوئی عمل انجام دیا ہوگا۔ سورہ حٰمٓ سجدہ کی آیت ۲۰، ۲۱، ۲۲ میں ہے۔

"ان کے خلاف ان کے کان ان کی آنکھیں، ان کی کھالیں گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں، وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے" تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ جواب دیں گی "ہمیں اسی خدا نے گویائی بخشی جس نے ہر چیز کو گویا

کر دیا ہے ــــــ اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو، تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے۔ تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی بلکہ تم نے یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو خبر بھی نہیں ہے۔"

دوسرے قسم کے اعمال جن کو قرآن پیچھے چھوڑے ہوئے اثرات یا آثار کہتا ہے، ان سے مراد وہ ساری کوششیں، کاوشیں اور حرکتیں ہیں جن کے اثرات آدمی اپنے خاندان، اپنے عزیز و اقارب اپنے سماج اور اپنی آئندہ نسل پر چھوڑ کر جاتا ہے۔ جو اچھائی یا برائی اس کی ذات سے پھیلی ہے اور لوگوں نے اُس کے اچھے بُرے اثرات قبول کئے ہیں، اپنی اولاد اور اپنے چھوٹوں اور زیر دستوں کی جو اچھی یا بُری تربیت اُس نے کی ہے۔ اپنے خاندان اور سماج میں جن اچھائیوں یا بُرائیوں کی بنیاد اُس نے ڈالی ہے۔ اور جن اچھے یا بُرے طور طریقوں کا پرچار کر کے وہ رائج کر گیا ہے۔ یا جو ہوں، مسجدیں، مدرسے، کتب خانے وہ تعمیر کر گیا ہے لوگوں کے فائدے کے لئے جو باغات اور درخت وہ لگا گیا ہے۔ ذہن و فکر کی تعمیر کے لئے جو کتابیں اور صالح لٹریچر وہ تیار کر گیا ہے، یا عیاشی اور بد اطواری کے جو مراکز وہ قائم کر گیا ہے، ذہن و فکر کو آوارہ کرنے والا جو لٹریچر یا کتابیں وہ تصنیف کر گیا ہے، یا جن کو پھیلانے کی اس نے سعی کی ہے ــــــ یہ سب وہ اعمال و آثار ہیں جو آدمی اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے۔ ان کے اثرات جہاں جہاں تک پہنچیں گے اور جب تک باقی رہیں گے اس کے نامۂ عمل میں ان کا اندراج ہوتا رہے گا۔ اور ان سب کی جزا یا سزا انسان کو بھگتنی ہوگی۔

اس حقیقت کی توضیح جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ارشادات میں فرمائی ہے، آپ کا ارشاد ہے:۔

"جس کسی نے نیکی اور ہدایت کی طرف کسی کو بُلایا تو اُس کو اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا جتنا عمل کرنے والے کو ملے گا۔ اور عمل کرنے والے کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جس کسی نے کسی کو گناہ اور گمراہی کی طرف بلایا، تو اس کو بھی اتنی ہی سزا ملے گی جتنی گناہ کرنے والے کو، اور گناہ کرنے والے کی سزا میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ (صحیح مسلم)

نوٹ "امام مبین" سے مراد وہ عظیم کتاب ہے جس میں کائنات کی ہر چیز درج ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس میں محفوظ و موجود نہ ہو یہ ایک ایسی واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے کہ جب قیامت کے روز سامنے لا کر رکھی جائے گی

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ

اور ان کو مثال کے طور پر اس بستی والوں[21] کا قصہ سنائیے[22]، جب کہ اس میں رسول آئے تھے، جب ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں

تو ہر دیکھنے والا اپنے اعمال کو دیکھتے ہی پوری حقیقت سمجھ جائے گا۔ نہ کسی بات کی وضاحت اُسے مطلوب ہوگی نہ دلیل۔ ہر عمل وحرکت اور ہر قول واشارہ اس میں اپنی ساری کیفیات اور مناظر کے ساتھ اس طرح نظر آئے گا۔ کہ آدمی حیران ہو کر کہے گا۔ عجیب کتاب ہے یہ کہ اس میں تو کوئی چھوٹی بڑی بات چھوٹی ہی نہیں ہے۔ سورہ الکہف آیت ۴۹ میں ہے۔

اور "الکتاب" سامنے لا رکھی جائے گی، اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرمین اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ہائے ہماری کم بختی! کیسی عجیب کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہو، جو جو کچھ انھوں نے کیا تھا، وہ سب اپنے سامنے موجود پا رہے ہوں گے۔ ــــ اور آپ کا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا"۔

[21] اکثر مفسرین نے اس موقع پر ایک عجیب وغریب اور دلچسپ قصہ نقل کیا ہے جو عیسائیوں کی غیر مستند روایات سے ماخوذ ہے اور تاریخی حیثیت سے اس کی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوتی۔ ان مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ جس بستی کی مثال یہاں دی گئی ہے اس سے مراد شام کا مشہور شہر انطاکیہ ہے۔ جہاں ایک بُت پرست بادشاہ کی حکمرانی تھی، اس کا نام انطیخس ابن انطیخس ابن انطیخس تھا۔ دوسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ جن رسولوں کے بھیجنے کا یہاں ذکر ہے ان سے مراد وہ مبلّغین ہیں، جن کو عیسیٰ علیہ السلام نے اس بستی میں تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔ بعض مفسرین نے عیسیٰؑ کے ان مبلّغین کے نام بھی لکھے ہیں، پہلے دو کے نام یحنا اور بولس ہیں اور تیسرے کا نام شمعون ہے۔ مگر اس عجیب وغریب قصّے کی یہ دونوں بنیادی باتیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں، روایت وتاریخ کے اعتبار سے بھی غلط معلوم ہوتی ہیں اور قرآن کے الفاظ سے بھی ان کی تائید نہیں ہوتی۔

بائیبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انطاکیہ وہ پہلا شہر ہے جہاں کثرت سے غیر اسرائیلیوں نے دین مسیح قبول کیا تھا، عیسائیوں کے چار مشہور مرکزی شہر تھے، قدس، انطاکیہ، اسکندریہ اور رومیہ۔ اور انطاکیہ کو یہ اہمیت اس لئے حاصل تھی کہ سب سے پہلے اسی شہر کے باشندے کثرت سے حضرت مسیحؑ پر ایمان لائے تھے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ بستی کے لوگوں نے رسولوں کو جھٹلایا! ان کی دعوت کا انکار کیا، اور خدا نے ایک زبردست دھماکے کے ذریعے ان کو بجھا کر رکھ دیا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً	بس ایک دھماکہ ہوا اور وہ سب
فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ ۝	کے سب بجھ کر رہ گئے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن جس بستی کا ذکر کر رہا ہے وہ کوئی دوسری بستی ہے جو پیغمبروں کی تکذیب اور انکارِ حق کے جرم میں خدا کے غضب اور عذاب سے تباہ و برباد ہوئی۔

پھر ان قدیم مفسرین کی یہ بات بھی روایت و درایت کے اعتبار سے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ یہ رسول حضرت عیسیٰؑ کے بھیجے ہوئے مبلغین تھے۔ عیسائیوں کی کسی مستند روایت سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں میں سے کسی کو مبلغ بنا کر انطاکیہ بھیجا ہو، بلکہ بائیبل کی کتاب اعمال سے تو اس کے برخلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد عیسائی مبلغین پہلی مرتبہ انطاکیہ پہنچے۔ قرآن پاک کے الفاظ بھی صاف صاف یہی بتاتے ہیں کہ یہ براہ راست خدا کے بھیجے ہوئے رسول تھے، حضرت عیسیٰؑ کے بھیجے ہوئے مبلغین نہیں تھے۔

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ	جب ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو ان لوگوں نے
فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ	ان دونوں کو جھٹلایا پھر ہم نے ان کی مدد اور تقویت کے
فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۝	لئے تیسرا بھیجا اور ان سب نے ان کو بتایا کہ ہم رسول کی حیثیت سے تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

پھر مکے والوں کے سامنے اس بستی کا قصہ بطور مثال رکھنے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہوں، مکے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ آج تم خدا کے رسول کے ساتھ جو بدسلوکی کر رہے ہو، اور ڈھٹائی کے ساتھ ان کی دعوت کو جھٹلا رہے ہو، تو اپنے انجام پر غور کر لو۔ اس بستی کے رہنے والوں کے پاس بھی خدا کے رسول خدا کا پیغام لے کر پہنچے تھے، مگر جب انھوں نے پیغمبروں کی بات مان کر نہ دی اور

انکارِ حق پر ہی اڑے رہے تو خدا نے ان کی پوری بستی کو تباہ و برباد کر دیا۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کون سی بستی تھی، رسولوں کے نام کیا تھے کس زمانے میں یہ بھیجے گئے تھے یہ ساری باتیں نہ قرآن نے بتائی ہیں نہ کسی صحیح حدیث میں بیان ہوئی ہیں، نہ ان رسولوں کے نام اور زمانے کا تعین کسی مستند روایت میں کیا گیا ہے، ایسی صورت میں جو بات بھی کہی جائے گی وہ محض قیاس اور اندازہ کی بات ہی ہوگی اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی پھر یہ ساری معلومات اور تحقیقات تاریخ کے طالبعلموں کے لئے تو بے شک دلچسپی کا موضوع ہوسکتی ہیں۔ مگر قرآن جس غرض کے لئے یہ واقعہ بیان کر رہا ہے اس کے لئے بستی کا نام، رسولوں کا نام، اور زمانہ معلوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

قرآن پاک کا موضوع دراصل تذکیر و موعظت ہے، وہ واقعات اور تمثیلات اس لئے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے اس سے سبق حاصل کریں، سرکشی اور نافرمانی چھوڑ کر ہدایت کی راہ پر آجائیں۔ اب اگر قرآن کا طالب علم قرآن کے اس اصل موضوع کو چھوڑ کر تاریخی بحث و تحقیق میں ہی الجھ جائے تو اُسے قرآن سے کیا حاصل ہوگا۔ اس لئے قرآن یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا پڑھنے والا اور اس کی دعوت دینے والا اس بحث اور جستجو میں پڑے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا کی کتاب سے استفادہ کرنے والا کسی لمحے بھی قرآن کی اصل غرض کو نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دے۔ وہ ہمیشہ اس حقیقت پر اپنی نگاہ مرکوز رکھے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے، قرآن واقعات اور قصص اس لئے بار بار دُہراتا ہے۔ اور اس کے مختلف گوشے سامنے لاتا ہے کہ انسان عبرت و ہدایت حاصل کرے۔ اور غلط روی چھوڑ کر صحیح راہ پر آجائے۔ سورہ الکہف میں اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔

"کچھ لوگ کہیں گے وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا، اور کچھ دوسرے لوگ کہیں گے پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں، کچھ اور لوگ کہتے ہیں، سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، کہو میرا رب ہی جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔"

یہ اقوال نقل کرنے کے بعد بھی قرآن نے صاف صاف ان کی تعداد نہیں بتائی بلکہ یہ ہدایت فرمائی کہ ان کی تعداد کے بارے میں کسی سے بحث نہ کیجئے اور نہ کسی سے اس کی تحقیق کیجئے۔ اس لئے کہ قرآن کا مقصد ان تاریخی حقائق کو بیان کرنا نہیں ہے۔ نگاہ اس حقیقت اور غرض پر مرکوز رکھئے جس کے لئے قرآن یہ واقعہ بیان کر رہا ہے۔

فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ﴿١٤﴾ قَالُوا مَا أَنتُمْ

نے ان دونوں کو جھٹلا دیا پھر ہم نے تیسرا ان کی مدد اور تقویت کے لئے بھیجا اور ان سب نے ان کو بتایا کہ ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں ۲۳ے

فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ○ (سورۃ الکہف)

بس آپ سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں سے بحث نہ کیجئے اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ تحقیق کیجئے۔

یعنی نہ تو اس بحث میں پڑیے کہ ان کی اصل تعداد کیا تھی؟ نہ اس تحقیق و جستجو میں وقت صرف کیجئے کہ وہ کون تھے، ان کے کیا کیا نام تھے، کس مقام پر تھے، کس زمانے میں تھے، قصہ بیان کرنے کی اصل غرض پر نگاہ رکھیے۔

غور و فکر کی اصل بات یہ ہے کہ ان بندگانِ خدا نے جو کچھ کیا وہی کرنے کا کام ہے۔ حق کی خاطر انھوں نے جو جو قربانیاں دیں، حق اپنے ماننے والوں سے یہی چاہتا ہے۔ حق پر جس طرح وہ ثابت قدم رہے۔ یہی ثابت قدمی مطلوب ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کو خدا کی مدد اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔

۲۲ے یعنی اس بستی والوں کا قصہ سنا کر مکّے کے ان سرکشوں کو جھنجھوڑیے کہ کیا تم بھی اسی انجامِ بد کے لئے تیاری کر رہے ہو، جس انجام بد سے یہ لوگ دوچار ہوئے تھے، ان سرکشوں نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا، غرور و تکبر، ہٹ دھرمی، تعصب اور نادانی میں مبتلا ہو کر ڈھٹائی کے ساتھ حق کا انکار کیا۔ اور خدا کے رسولوں کی تحقیر کی۔ یہی سب کچھ تم بھی کر رہے ہو، انہی کے نقش قدم پر چل کر آخر اپنی شامت کیوں بلا رہے ہو۔ اگر تم اپنے دشمن نہیں، ہو تو ان کی عبرت انگیز تاریخ سے سبق حاصل کرو۔ اور اس رسوائی اور عذاب سے دوچار ہونے کی تیاری نہ کرو۔ جس سے یہ بدنصیب دوچار ہوئے تھے۔

۲۳ے "ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں" رسولوں کا یہ قول بستی والوں کے لئے زبردست وارننگ اور ہلا دینے والی تنبیہ تھی، یعنی ہم از خود یہ پیغام لے کر تمہارے پاس نہیں آ گئے ہیں یہ دعوت و پیغام ہم نے خود گڑھ کر تمہارے سامنے پیش نہیں کیا ہے ہم خدا کے بھیجے ہوئے تمہارے پاس آئے ہیں، ہم خدا کے نمائندے ہیں اس کا پیغام

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا أَنزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ﴿۱۵﴾

بستی والوں نے کہا، تم کچھ نہیں[۲۴] ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمٰن نے ہر گز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے[۲۵] تم محض جھوٹ بولتے ہو

لے کر تمہارے پاس آئے ہیں، تم اس پیغام کو جھٹلا کر خدا کے پیغام کا انکار کر رہے ہو، ہمارے ساتھ ناروا سلوک کر کے خدا کے نمائندوں کی توہین کر رہے ہو، تمہاری ہٹ دھرمی، جہالت، کبر و غرور تمہیں خدا کے ساتھ گستاخی پر آمادہ کر رہا ہے۔ ہماری مخالفت دراصل خدا کی مخالفت ہے۔ خوب سمجھ لو، کیا خدا سے مخالفت مول لے کر اور اس کی شان میں گستاخی کر کے تم اس کی گرفت سے بچ سکو گے۔

کسی بستی میں رسول کی آمد معمولی واقعہ نہیں ہوتا، وہ جب کسی بستی میں آتا ہے تو خدا کا فیصلہ بن کر آتا ہے۔ وہ بستی والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرنے آتا ہے۔ رسول کی آمد کے بعد صرف دو ہی گروہ ہوتے ہیں، حق پرست گروہ، اور حق دشمن گروہ، حق پرست وہ ہوتا ہے جو رسول پر ایمان لائے اور رسول کا ساتھ دے اور رسول کی راہ پر چلے۔ حق دشمن گروہ وہ ہوتا ہے جو رسول کا انکار کرے، رسول کی مخالفت کرے، اور اپنی گمراہی پر اڑا رہے ــــ خدا اس گروہ کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہے، بار بار تنبیہ کرتا ہے، مگر جب اس کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، اس کے گناہوں اور زیادتیوں کا ڈول بھر جاتا ہے تو آخر کار یہ ڈوب جاتا ہے، خدا کا غضب بھڑک اٹھتا ہے، اور زمین کا کوئی ہیبتناک دھماکہ یا فضا کی کوئی ہولناک چیخ حق دشمنوں کی پوری بستی کو تہس نہس کر دیتی ہے۔

خوب اچھی طرح سوچ لو، کہ خدا کے ہم تین نمائندوں کو جھٹلا کر تم کس انجام کی تیاری کر رہے ہو، اور خدا کے کس فیصلے کے منتظر بن رہے ہو۔

۲۴ ۔ "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان" یعنی ہم تمہیں خدا کا رسول کیسے تسلیم کر لیں، انسان تو رسول نہیں ہو سکتا اگر انسان رسول ہو سکتا، تو ہم بھی رسول ہوتے، تمہیں خدا نے رسول بنایا ہے تو ہمیں کیوں نہیں بنایا آخر تمہارے اندر ایسی کون سی خوبی ہے، جو تمہیں خدا نے اپنی رسالت کے لئے منتخب کر لیا، یہ سب تمہاری من گھڑت باتیں ہیں تم ہم پر اپنی فضیلت جمانا چاہتے ہو، تم ہم جیسے انسان ہی تو ہو آخر تمہیں کیا امتیاز حاصل ہے، کہ ہم تمہیں رسول مان لیں، اور اپنے جیسے چند انسانوں کی پیروی کرنے لگیں۔

مکّے کے منکرین بھی یہی سوچتے تھے، اور اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے تھے، وہ کہتے تھے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ	یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور
وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط (الفرقان ۷)	بازاروں میں چلتا پھرتا ہے

"کھانا کھاتا ہے"، کہہ کر وہ انسان کی ان ساری بشری کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے تھے جو کھانا کھانے کے نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہیں، "بازار میں چلتا پھرتا ہے" یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے عام انسانوں کی طرح بازار میں گھومتا پھرتا ہے۔ بالفرض اگر خدا انسان ہی کو رسول بنانا چاہتا تو کسی ایسے خوش حال آدمی کو بناتا جو وقار کے ساتھ اپنے محل میں بیٹھا رہتا، عام انسانوں کی طرح یوں بازاروں میں چلتا پھرتا تو نظر نہ آتا۔ وَقَالُوْا

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ	اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے
مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ط (زخرف ۳۱)	آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔

دونوں شہروں سے مراد مکّہ اور طائف ہیں وہ کہتے تھے اول تو یہی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان خدا کا رسول ہو، اور اگر مان بھی لیا جائے تو کیا مکّے میں ولید بن مغیرہ، عتبہ بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے! طائف میں عروہ بن مسعود، حبیب بن عمرو، کنانہ بن عبد عمرو، اور ابن عبد یالیل جیسے کھاتے پیتے لوگ نہ تھے، آخر ایسے بڑے معزز اور باوقار افراد کے ہوتے ہوئے خدا نے ایک نادار اور یتیم بچے کو رسالت کے لئے کیونکر منتخب کیا!

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا	اور یہ ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص
هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	تم جیسے بشر کے سوا آخر اور کیا ہے پھر کیا تم آنکھوں
اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ	دیکھتے اس جادو کے شکار ہو جاؤ گے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرینِ رسالت نے عام طور پر ہر دور میں یہی بات کہی ہے۔ یہ صرف مشرکین مکّہ ہی کی دریافت نہیں ہے، بلکہ اس جہالت کا اظہار، جاہل قوموں نے ہمیشہ کیا ہے، اور رسولوں کی دعوت کو جھٹلاتے ہوئے انھوں نے اسی کج فکری کا مظاہرہ کیا ہے "اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا" تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر یہ جاہلانہ جملہ قریب قریب ہر دور کے رسول کو سننا پڑا ہے۔

اس بدترین جہالت کی ابتدا نہایت معصوم اور بے ضرر ہوتی ہے، مگر دھیرے دھیرے یہی بظاہر

بے ضرر جہالت قبولِ حق اور اطاعتِ حق کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے، ہوتا یہ ہے کہ دینی شخصیتوں کو ان کے معتقدین عقیدت کے غلو میں انسانوں سے کچھ اونچا سمجھنے لگتے ہیں، انسانی ضرورتوں اور بشری تقاضوں سے ان کو بالاتر رکھ کر کچھ جذباتی اطمینان سا محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کی ذات کے ساتھ کچھ ڈرامائی انداز کی صفات اور خصوصیات منسوب کر کے ان کی شخصیتوں کو کچھ عجوبہ سا بنا لیتے ہیں، پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، اور ذہن و قلب کی تربیت، اور تطہیر و تزکیے کا نظام ڈھیلا پڑتا جاتا ہے۔ یہ غلط تصورات اور مفروضات ذہن و قلب پر چھاتے چلے جاتے ہیں، اور طرح طرح قصے اور واقعات تصنیف ہونے لگتے ہیں جن سے جاہل عوام یہ باور کرنے لگتے ہیں کہ یہ دینی شخصیتیں، بشری حاجات اور انسانی کمزوریوں سے بالاتر تھیں اور ان کے پاس کچھ مافوق الفطرت قسم کی قوتیں تھیں ـــ جہالت اور وہم پرستی کی یہ لے یہاں تک بڑھتی ہے کہ یہ ہستیاں انسان نہیں کچھ اور بن جاتی ہیں، ان کے بارے میں انسان ہونے کا تصور ان کی تحقیر و تذلیل اور گمراہی کی علامت بن جاتا ہے ـــ اور یہ جہالت ایک مسلمہ حقیقت بن کر ذہنوں پر چھا جاتی ہے کہ رسول انسان نہیں ہوتے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اپنے ان گمراہ بندوں پر رحم کھا کر نیا رسول بھیجتا ہے تو وہ کہتے ہیں کیا ہماری عقل ماری گئی ہے کہ انسان کو ہم رسول مان لیں اور اس کی پیروی کرنے لگیں۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ (المومنون ۳۳، ۳۴)	یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، کھاتا ہے وہی جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے وہی جو تم پیتے ہو، اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت کر لی، تو تم بڑے گھاٹے میں رہے۔

یہ بات ان کے حلق سے اُترتی ہی نہیں کہ خدا کا نمائندہ اور رسول انسان ہو سکتا ہے وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا سے کبھی یہ بات سنی ہی نہیں کہ انسان رسول بن کر آتے ہیں، وہ یوں سوچتے ہیں کہ اگر اللہ کو رسول ہی بھیجنا ہوتا تو فرشتوں کی کیا کمی تھی۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ	یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا اور چاہتا ہے کہ تم پر اپنی

لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ ○

(المومنون ۲۴)

فضیلت جمائے حالانکہ خدا چاہتا تو فرشتے نازل کرتا، ہم نے تو اپنے باپ دادا سے یہ بات کبھی نہیں سنی کہ انسان رسول بن کر آئے۔

قرآن نہایت زور اور صراحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لئے ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ انسانوں کے لئے انسان ہی نمونہ ہو سکتا ہے، فرشتہ نمونہ نہیں ہو سکتا اور نہ اور کوئی ایسی ہستی انسانوں کے لئے نمونہ بن سکتی ہے، جو انسانوں سے بالاتر ہو، — ہاں اگر روئے زمین پر فرشتے رہ بس رہے، ہوتے تو فرشتے کو ان کے لئے رسول بنا کر بھیجا جاتا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ۔

(انبیاء ۷)

اے محمدؐ آپ سے پہلے بھی ہم نے انسانوں کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○

(بنی اسرائیل ۹۵)

ان سے کہئے اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور کسی فرشتے کو ان کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

در اصل پیغمبر کا کام اگر صرف اتنا ہوتا کہ وہ پیغام سنا دیتا اور بس۔ تو بے شک یہ کام فرشتے بھی کر سکتے تھے، لیکن رسول کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے، وہ اپنے پیغام کے مطابق انسانوں میں تربیت و اصلاح کا کام کرتا ہے۔ عملی زندگی میں اپنے لائے ہوئے اصولوں کا انطباق کرتا ہے۔ اپنی دعوت پر خود عمل کر کے دکھاتا ہے۔ اور دوسروں کے لئے بہترین نمونہ بن کر، ان کو عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ پیغام پر ایمان لانے والوں کی تنظیم و تربیت کرتا ہے، افہام و تفہیم کرتا ہے، ذہنی الجھنیں صاف کرتا ہے۔ مخالفت اور مزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں جدوجہد کرتا ہے — پریشانیاں اٹھاتا ہے، قربانیاں دیتا ہے اور ہر ہر میدان میں اپنے پیروؤں کے لئے پیروی کا بہترین نمونہ بنتا ہے اور پیروی کرنے والے اس یقین اور شعور کے ساتھ پیروی کرتے ہیں، کہ یہ دین انسانوں کے لئے ہے، انسان کے لئے ہر حال میں قابلِ عمل ہے، اس لئے کہ اس پر عمل کر کے دکھانے والے بہترین انسان ہی ہیں۔

بے شک اس مضمون کی آیتیں اصلاً انھیں لوگوں کے لئے ہیں جو رسول سے برسرِ پیکار تھے، اور اس لئے رسول کا انکار کر رہے تھے، کہ رسول انسان ہیں مگر قرآن رہتی زندگی تک کے لئے ہدایت اور روشنی ہے یہ دعوت کی کتاب بھی ہے اور تربیت کی کتاب بھی، یہ اس کی حکمت، اعجاز اور جامعیت ہے کہ یہی آیتیں مخالفینِ رسول کے لئے بھی ہدایت کی راہ کھولتی ہیں، اور یہی آیتیں مسلمانوں کو بھی چوکنا اور ہشیار کرتی ہیں کہ وہ حق کی روشنی ملنے کے بعد پھر کہیں اس جہالت میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ یہ وہ بدترین جہالت ہے جو قبولِ حق کی راہ میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور دین کی صحیح اتباع اور کامل اطاعت کی راہ میں بھی۔ پچھلی اُمتیں اسی جہالت اور حماقت کے باعث حق کو قبول کرنے سے محروم رہیں، اور اسی کے باعث حق پانے کے باوجود پھر گمراہ ہوگئیں۔

قرآن کی ان تصریحات کے ساتھ ساتھ دین میں عملی طور پر بھی یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ بار بار اس حقیقت کی یاد دہانی ہوتی رہے اور مسلمان کے دل میں یہ بات اچھی طرح رچ بس جائے کہ رسول "خدا کے بندے ہی ہوتے ہیں کچھ اور نہیں ہوتے"۔ کلمۂ شہادت جس کا اقرار کر کے ہی آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے اُس کا ایک جُز یہ بھی ہے "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں"۔

پانچ وقت کی نماز میں مسلمان خدا کے حضور بار بار یہ جُملہ دہراتا ہے کہ "محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں"۔ پھر حضورؐ نے بھی بار بار اُمت کو تنبیہ فرمائی اور تاکید کی کہ دیکھو مجھے حد سے نہ بڑھانا بے شک میں تمام انسانوں سے افضل ہوں، تمام رسولوں کا سردار ہوں، خاتم النّبیّین ہوں، خدا کے بعد میرا ہی مرتبہ ہے، مگر میں خدا کا بندہ ہوں، تم مجھے خدا کا بندہ ہی سمجھو، آپ کا ارشاد ہے۔

لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی	مجھے حد سے نہ بڑھاؤ، جس طرح عیسائیوں
بْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا	نے عیسیٰ بن مریم کو حد سے بڑھا دیا، میں
عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ	تو اس کا بندہ ہی ہوں تو مجھے اس کا بندہ
(بخاری، مسلم)	اور اس کا رسول ہی کہو۔

مگر قرآن پاک کی ان واضح تعلیمات وہدایات، بار بار یاد دہانی کی عملی تدابیر، اور رسول کریمؐ کی زبردست تنبیہات کے باوجود امت کا ایک بڑا گروہ پھر اسی جہالت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور وہ قرآن وسنت کی ان واضح اور قطعی تعلیمات سے منہ موڑ کر رسولؐ کی مخالفت کر رہا ہے، مگر اس گمراہ کُن فریب میں مبتلا ہے کہ وہ عشقِ

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾

رسولوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں ۲۶
اور ہم پر اس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم تمہیں صاف صاف پیغام پہنچا دیں ۲۷

رسول کا حق ادا کر رہا ہے۔

۲۵ یعنی تم جو یہ کہتے ہو کہ میرے پاس وحی آتی ہے تو یہ محض جھوٹ ہے، خدا انسان کی ہدایت کے لئے کوئی وحی نازل نہیں کرتا، انکارِ وحی ایک ایسی جہالت ہے، جس میں قدیم زمانے کی جاہل قومیں بھی مبتلا رہی ہیں اور آج کے نام نہاد عقلیت پسند بھی مبتلا ہیں، مکے کے مشرکین اگر ذرا انصاف اور عقل سے کام لیتے تو یہ دیکھ اور سمجھ سکتے تھے، کہ وحی کا نزول ایک حقیقت ہے ان کے پڑوس میں یہودی آباد تھے، جن کے پاس توراۃ تھی، اور وہ اُسے آسمانی صحیفہ ہی مانتے تھے، لیکن بُرا ہو تعصب اور حق دشمنی کا کہ وہ بھی کفار مکہ کو یہی باور کراتے تھے، کہ خدا کسی انسان پر وحی نازل نہیں کرتا یہ محض جھوٹ ہے، قرآن نے انھیں غیرت دلائی ہے کہ کچھ تو شرم کرو، یہ تم کیا کہہ رہے ہو، موسیٰؑ کون تھے، کیا وہ انسان نہیں تھے، اور ان پر تورات کس نے نازل کی تھی، کیا تورات آسمانی کتاب اور وحی نہیں ہے، یا اس کا نازل کرنے والا خدا کے سوا کوئی اور ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى

(الانعام ۹۱)

ان لوگوں نے ہرگز خدا کی قدر نہیں پہچانی، جب انھوں نے کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ان سے کہئے وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جو موسیٰ لے کر آئے

۲۶ تکذیب کرنے والوں کے جواب میں رسولوں نے اپنے رسول ہونے کا ثبوت جس انداز میں پیش کیا ہے یہ بڑا ہی فکر انگیز انداز ہے ــ پہلی بات تو رسولوں نے یہ کہی کہ "ہمارا رب جانتا ہے" یعنی ہماری رسالت کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے ہمیں پروا نہیں، جس نے ہمیں رسول بنا کر بھیجا ہے وہ جانتا ہے، دراصل معاملہ اسی سے ہے، اُسی نے ہمیں اس کام پر مامور کیا ہے، وہی ہمیں اس کام کو

انجام دینے کی قوت و ہمت بھی دے گا، وہی ہماری حفاظت بھی فرمائے گا، اسی کے سامنے ایک روز ہمیں اپنی کارگزاری پیش کرنی ہے اور وہی ہمیں اس کا صلہ عطا فرمائے گا ـــــ پھر ان الفاظ میں تکذیب کرنے والوں کے لئے تنبیہ بھی ہے ـــــ وہ یہ کہ تم لوگ ہمیں جھٹلا کر کس قدر سنگین جرم کر رہے ہو کبھی تم نے غور کیا ہمیں جھٹلا کر تم خدا کے پیغمبروں اور نمائندوں کو جھٹلا رہے ہو۔ یہ بدترین گستاخی اور بغاوت کی روش اختیار کر کے کیا تم خدا کے عذاب سے بچ سکو گے؟ اگر عقل و ہوش نام کی کوئی چیز بھی تمہارے پاس ہو تو اپنے رویے پر غور کرو۔

"ہم یقیناً تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں" یہ انتہائی تاکیدی انداز بیان ہے یعنی یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس پر شک و شبہ کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا، تم لوگ ہماری تکذیب کتنی ہی قوت سے کرو، کفر و انکار کی کیسی ہی مہم چلاؤ ـــــــــــــــــــ ہماری رسالت کو جھٹلانے کے لئے کیسا ہی پروپیگنڈہ کرو، تمہاری ان نازیبا حرکتوں سے حقیقت نہیں بدل سکتی، یہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں، اسی لئے وہ برابر ہماری تائید فرما رہا ہے، ہم جھوٹے ہوتے تو ہمیں ہرگز اس کی تائید نصیب نہ ہوتی، بلکہ وہ ہم سے سخت ترین انتقام لیتا، اور انتہائی عبرتناک سزا دیتا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمیں عزت و غلبہ عطا فرمائے گا۔ تمہارے مقابلے میں ہماری مدد کرے گا اور بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ فلاح و کامرانی کس کے لئے ہے اور ناکامی و نامرادی کس کے لئے ہے، یہی بات ہے جو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمائی ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ	اے نبی کہئے میرے اور تمہارے درمیان گواہی
شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ	کے لئے خدا ہی کافی ہے وہ آسمانوں اور زمین
وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	میں سب کچھ جانتا ہے جو لوگ باطل کو مانتے ہیں
بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ	اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (العنکبوت ۵۲)	رہنے والے ہیں۔

ے۲ یعنی ہماری ذمہ داری تو صرف یہ ہے کہ ہم خدا کا پیغام کھول کھول کر تمہارے سامنے بیان کردیں، دلنشیں انداز میں دلسوزی کے ساتھ خدا کی بات تم تک پہنچادیں، دین حق کو وضاحت کے ساتھ تمہارے سامنے رکھ دیں، اور اس کے تقاضے تمہیں سمجھادیں۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ ہم زبردستی تم سے حق منوائیں

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ

بستی والوں نے کہا ہم تمہیں اپنے لئے فالِ بد سمجھتے ہیں[۲۸]، اگر تم باز نہ آئے تو

اور نہ یہ ہمارے بس میں ہے کہ ہم تمہیں ہدایت کی راہ پر لگا دیں۔ ہدایت دینا صرف خدا کا کام ہے اور ہدایت صرف اسی کو ملتی ہے جو ہدایت کا طالب ہے۔ ہم نے خدا کی دعوت کھول کھول کر تمہارے سامنے بیان کر دی، بس یہی ہماری ذمہ داری تھی، اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ خدا کی دعوت کو قبول کرو۔ یا جھٹلاؤ۔ تمہارے کفر اور نافرمانی کی ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اگر تم نے دعوتِ حق قبول کی تو تمہیں دنیا اور آخرت کی سعادتیں نصیب ہوں گی اور اگر تم نے اس کو رد کر دیا تو پھر تمہیں کوئی چیز خدا کے غضب سے نہیں بچا سکتی۔

رسولوں کے اس قول میں داعیانِ حق کے لئے ایک اہم ہدایت بھی ہے اور سکون و اطمینان کا سامان بھی —— ہدایت یہ ہے کہ داعی کی ذمہ داری صرف دعوت و بلاغ نہیں ہے بلکہ بلاغ مبین ہے، یعنی دعوتِ حق کو وضاحت و صراحت کے ساتھ کسی جھجک اور تحفظ کے بغیر اس طرح بیان کرنا کہ پوری دعوت اور اس کے تقاضے نکھر کر سامنے آ جائیں، اور دعوت کے مخاطب اچھی طرح سمجھ لیں کہ خدا کا دین کیا ہے، وہ ان سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا مطالبے کرتا ہے، فرد اور سماج کی اصلاح اور تعمیر کے لئے کیا اصول اور ضابطے دیتا ہے، اور زندگی میں کس کس طرح کی تبدیلیاں چاہتا ہے۔ داعی نے اگر بلاغ مبین کا حق ادا کر دیا تو اس نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی، اور مخاطب گروہ پر حجت تمام ہو گئی۔ اتمام حجت کے بعد اگر لوگ بغاوت و سرکشی اختیار کرتے ہیں اور نافرمانی اور گمراہی کی روش پر ہی اڑے رہتے ہیں تو داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ خدا کے یہاں ان کی نافرمانی اور بغاوت کے لئے اُس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ وہ دوسروں کی گمراہی اور نافرمانی کا ذمہ دار ہرگز نہیں ہے، ہاں یہ بات اُسے بار بار سوچنا ہے کہ دعوت کی وضاحت اور بلاغ مبین کا حق ادا کرنے میں تو اُس نے کوئی کوتاہی اور مداہنت نہیں کی ہے۔ اس فرض میں اگر اس نے کوئی غفلت اور کوتاہی کی ہے، تو یہ فرض ناشناسی، کام چوری اور خیانت ہے، سخت ترین جرم ہے اور اُس کی باز پرس یقیناً داعیِ حق سے ہوگی۔

[۲۸] خدا کے پیغمبر جس بستی میں بھی خدا کی دعوت پیش کرتے ہیں، اور خدا کے بندوں کو جھوٹی پرستش

لَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ

ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور تم ہم سے بڑی دردناک سزا پاؤ گے

سے نکال کر ایک خدا کی بندگی کی طرف بلاتے ہیں وہاں کے معاشرے میں زبردست کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔ بیٹا دعوت قبول کر کے جھوٹے معبودوں سے بیزار ہو جاتا ہے اور ماں باپ بدستور انھیں معبودوں سے وابستہ ہوتے ہیں، ماں باپ خدا کے دین پر ایمان لے آتے ہیں اور اولاد غلط روش پر اڑی رہتی ہے۔ بیوی حق پر ایمان لے آتی ہے اور شوہر جاہلیت کی روش پر جما رہتا ہے۔ خاندان کے کچھ افراد دینِ حق پر ایمان لاکر اس کی تبلیغ و دعوت میں سرگرم ہوتے ہیں اور کچھ افراد ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں، اس اختلاف اور کشمکش سے قریب قریب ہر گھرانہ متاثر ہوتا ہے اور پورے معاشرے میں ایک کشاکش اور ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے ـــــ پھر جب نبی کی مخالفت کرنے والے کسی طور نبی کی بات مان کر نہیں دیتے ہیں، اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر ہی اڑے رہتے ہیں تو خدا تعالیٰ ان کو مختلف قسم کے ارضی اور سماوی مصائب و آفات میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ ان کے دِل نرم پڑیں، اور ان میں تضرع وزاری اور عاجزی کی کیفیت پیدا ہو، خدا کا ارشاد ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ○ (الاعراف ۹۴)	کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی میں لوگوں کو تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔

اس سختی اور تنگی سے کچھ سعید روحیں تو ضرور فائدہ اُٹھاتی ہیں، ان کے دل پسیجتے ہیں وہ خدا کے حضور گڑگڑاتے ہیں، اور ان میں توبہ اور انابت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے مگر جو سرکش، بغاوت کی روش پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو ان کے دل اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں اور ان کی ڈھٹائی کچھ اور بڑھ جاتی ہے

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام ۴۳)	جب ہماری جانب سے ان پر سختی آئی تو انھوں نے کیوں نہ عاجزی اختیار کی، مگر ان کے قلوب اور سخت ہو گئے۔ اور شیطان نے اُن کو یہ اطمینان دلا دیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔

انہی سرکشوں نے رسولوں سے کہا، تم ہمارے لئے منحوس ہو، تم نے آکر گھر گھر اختلاف پیدا کر دیا ہے تمہاری

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

رسولوں نے جواب دیا، "تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کیا تمہارا یہ طرزِ عمل اس لئے ہے کہ تمہیں نصیحت کی گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو"۲۹

ان باتوں سے ہمارے معبود ہم سے ناراض ہو گئے ہیں اور اسی لئے ہم ان آفتوں اور سختیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یہی بات کفار مکہ نے نبیؐ سے کہی تھی۔ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ "اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تمہاری بدولت ہے (النساء ۷۷) قرآن مجید میں جگہ جگہ ان لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ جاہلانہ باتیں ہر دور کے سرکشوں نے اپنے پیغمبروں سے کہی ہیں، قوم ثمود نے اپنے نبی حضرت صالحؑ سے کہا تھا، اِطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ہم نے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنے لئے منحوس پایا ہے۔ (النمل ۴۷)

اور اسی بیہودہ انداز سے فرعون اور اس کی قوم موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی، وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ اور جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو اُسے موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے ہیں۔

۲۹۔ رسولوں کا یہ جواب محض ایک الزامی جواب ہی نہیں ہے جو ایک عام شخص اپنے مخالف کی ڈھٹائی پر جھنجھلا کر اس کا منہ بند کرنے کے لئے دے دیا کرتا ہے۔ بلکہ یہ خدا کے رسولوں کا جواب ہے، اس میں فہمائش بھی ہے، تنبیہ بھی ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی۔ اس جواب کے تین جز ہیں۔

پہلی بات تو پیغمبروں نے یہ کہی کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہے، تم جو اپنی نحوست کا سبب ہمیں قرار دے رہے ہو تو یہ محض تمہاری نادانی اور گستاخی ہے۔ ہر شخص اپنی اچھائی یا بُرائی کا خود ذمہ دار ہے۔ ہر آدمی اپنے کئے کے نتائج ہی بھگتتا ہے، ہر شخص کی گردن میں اُسی کا نوشتۂ تقدیر لٹکا ہوا ہے۔ تم جو کچھ بھگت رہے ہو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ — اور ہر شخص کا شگون ہم نے اس کی گردن میں لٹکا رکھا ہے۔

لہٰذا ہمیں الزام دینے کے بجائے، اپنے طرزِ عمل پر غور کرو۔ اپنی اچھائی بُرائی کے لئے اپنے اعمال، اپنی سیرت، اور اپنی ذات پر غور و فکر کی نگاہ ڈالو، اپنی خوش بختی یا بدبختی کے ذمہ دار تم خود ہو، دوسروں پر ذمہ داری ڈالنے سے تمہاری بدبختی دور نہیں ہو سکتی۔ اگر تم واقعی اپنے خیر خواہ ہو تو اپنی روش پر غور

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ

اور شہر کے دور دراز کنارے سے ایک شخص دوڑا ہوا آیا[۳۰]، اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کی پیروی کرو۔

کرو۔ اور ان مہمل باتوں سے باز آجاؤ۔

دوسری بات رسولوں نے یہ کہی کہ کیا تم نے یہ طرزِ عمل اس لئے اختیار کیا کہ ہم نے تمہیں نصیحت کی۔ ہم نے تمہیں تمہارے رب کا پیغام پہنچایا، اور تم اس کے جواب میں یہ گستاخی، سرکشی، اور بغاوت کی روش اختیار کر رہے ہو، سوچو ہم تم سے کیا چاہتے ہیں، ہم صرف یہی تو کہتے ہیں کہ اپنے رب کی بندگی کرو اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ عبادت کے لائق صرف خدا کی ذات ہے، اس کا صلہ تم ہمیں یہ دے رہے ہو کہ ہمیں سنگسار کرنے کی دھمکی دے رہے ہو، دردناک سزاؤں سے ڈرا رہے ہو، اور طرح طرح سے ستا رہے ہو۔ کچھ تو سوچو۔ آخر تذکیر و نصیحت کے جواب میں تمہارا یہ رویہ کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

آخری بات رسولوں نے یہ کہی کہ "تم حد سے گزر چکے ہو، تمہاری سرکشی، جہالت اور حق دشمنی اس حد تک بڑھ چکی ہے، کہ اب تم حق بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہو، حق دشمنی میں تم اندھے ہو چکے ہو، اچھائی برائی کی تمیز کھو چکے ہو، اور جہالت و نادانی میں اس حد تک بڑھ چکے ہو کہ ان لوگوں کی دشمنی پر اُتر آئے ہو، جو تمہارے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم خدا کے غضب سے بچ کر سیدھی راہ پر لگ جاؤ۔

[۳۰] یہ ایک نیک فطرت عبادت گزار بندہ تھا، مفسرین نے اس کا نام حبیب لکھا ہے، یہ شہر کے دور دراز کنارے پر رہتا تھا، محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتا، اس میں سے آدھا اپنے بال بچوں کے لئے رکھتا، آدھا راہِ خدا میں خرچ کرتا اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہتا، اس مردِ صالح نے جب رسولوں کی دعوت اور ان کے ساتھ اپنی قوم کی زیادتیوں کا حال سنا۔ تو وہ دوڑا دوڑا شہر میں آیا، رسولوں کی مخالفت کے بھیانک انجام سے وہ لرز گیا۔ اور اس نے اپنی قوم کو سمجھایا، قرآن پاک کے اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسولوں کی دعوت شہر کے دور دراز گوشوں تک پہنچ چکی تھی، اور خدا کے نیک فطرت بندے اس سے متاثر ہو رہے تھے۔

اتَّبِعُوا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۟ وَمَا لِيَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْ
فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۟

پیروی ان لوگوں کی کرو جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے[۳۱] اور سیدھے راستے پر ہیں آخر کیوں نہ میں اس کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اور جس کے پاس تمہیں پلٹ کر جانا ہے[۳۲]

۳۱؎ اس مردِ صالح نے نہایت درد کے ساتھ اپنی قوم کو سمجھایا، اور رسولوں کی مخالفت سے باز رہنے ان پر ایمان لانے کے لئے اس نے قوم کے سامنے دو ایسی باتیں رکھیں۔ کہ اگر ان میں قبولِ حق کی کوئی بھی رمق باقی ہو تو وہ حق کے آگے جھک جائیں۔

اس نے کہا۔ یہ لوگ تم سے کسی اجر کے طالب نہیں ہیں، اور صرف خدا سے اپنا اجر لینے کے لئے تمہاری گستاخیاں اور زیادتیاں برداشت کر رہے ہیں، نہ تم سے مال و دولت کے خواہاں ہیں، نہ اقتدار اور سرداری چاہتے ہیں، نہ اور کوئی ان کا ذاتی مفاد ہے، یہ تم بھی دیکھ اور سمجھ رہے ہو، پھر سوچو کہ ایسے بے غرض اور بے لوث انسان جو بات کہہ رہے ہیں اور خدا کی طرف منسوب کر کے کہہ رہے ہیں، وہ کیونکر غلط ہو سکتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ یہ خود سیدھے راستے پر ہیں، سیدھے راستے پر ہونے کے لئے دو ہی باتیں دیکھی جا سکتی ہیں، ایک یہ کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں علم و عقل کی روشنی میں اس کا کیا مقام ہے، تو غور کرو ان کی دعوت سراسر معقول ہے۔ پھر جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں خود بھی اس پر کاربند ہیں، ان کی زندگیاں ان کی دعوت کے عین مطابق ہیں۔ ان کے قول و عمل میں تضاد نہیں ہے جو کہتے ہیں وہی خود بھی کرتے ہیں ان کی سیرت بے داغ ہے، ان کی زندگیاں پاکیزہ ہیں، ان کا قول و عمل سچا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایسے بے لوث اور برسرِ حق لوگوں کی بات نہ مانی جائے۔ اور ان کی پیروی نہ کی جائے۔ ان کی مخالفت خود اپنے ساتھ دشمنی ہے۔ اور ان کی بدخواہی دراصل اپنی بدخواہی ہے۔

اس مردِ صالح نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنی قوم کو سمجھایا کہ خدا کے رسول یہی تو کہتے ہیں کہ اپنے پیدا کرنے والے کی بندگی کرو۔ پیدا کرنے والے کی بندگی تو ہونی ہی چاہیئے، یہی عقل کا بھی تقاضا ہے، فطرت کا بھی تقاضا ہے، اور انسانی ضمیر کی بھی یہی آواز ہے۔ نامعقول بات تو یہ ہے کہ آدمی

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ

کیا میں اس (معبودِ برحق) کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنالوں ۳۳ حالانکہ اگر وہ بے پایاں رحم کرنے والا مجھے کسی دُکھ یا نقصان میں مبتلا کرنا چاہے تو نہ ان کی سفارش ہی میرے کسی کام آسکتی ہے

ان ہستیوں کی بندگی کرے، جن کا اس کے پیدا کرنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پھر یہ حقیقت اس مردِ صالح نے اس دلنشیں استدلال کے ساتھ ساتھ اس قدر مؤثر پیرائے میں بیان کی ہے کہ اگر قلب بالکل ہی مُردہ نہ ہوچکا ہو تو آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، مردِ صالح نے یہ کہنے کے بجائے کہ تم لوگ آخر اس خدا کی بندگی کیوں نہیں کرتے جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اپنی ذات پر رکھ کر یوں بات سمجھائی، "آخر کیوں نہ میں اس کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے" اس طرزِ بیان سے بات کی تاثیر غیر معمولی حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے انجام کی فکر کے جذبے کو ابھارا اور یہ کہا کہ آخر کار جانا بھی اسی خدا کے حضور ہے، جس نے پیدا کیا ہے۔ یہاں پھر اس نے حکمتِ تبلیغ کا کمال دکھایا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ مجھے اس کے حضور جانا ہے۔ بلکہ یوں کہا، تمہیں اسی کے حضور پلٹ کر جانا ہے۔ مخاطب کو فکر مند بنانے، غفلت سے جگانے اور اس کی عقل و فکر پر راست چوٹ لگانے کے لئے یہ انداز انتہائی کارگر ہوتا ہے کہ اُسے اُس کا انجام یاد دلا کر یہ بتایا جائے کہ یہ کچھ تمہیں پیش آنے والا ہے اور یہ کچھ تمہیں بھگتنا ہے، اگر تمہیں انجام کی کچھ بھی فکر ہے، تو اپنے رویے پر سنجیدگی سے غور کرو۔

۳۳ سوال کے پیرائے میں یہ ایسا انکار ہے جس میں مخالفین کی عقل و فہم کو شدت کے ساتھ جھنجوڑا گیا ہے۔ مردِ مومن ان سے کہہ رہا ہے، "میں یہ نامعقول حرکت ہرگز نہیں کرسکتا۔ کہ اپنے اس خدا کو چھوڑ دوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کے حضور مجھے حاضر ہونا ہے اور ان کو معبود بنالوں، جن کے قبضے میں کچھ نہیں ہے ۔ کیا کسی بھی صاحبِ عقل و فہم کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ایسی جہالت و حماقت کرے ۔ زندگی اور زندگی کا انجام جس خدا کے قبضے میں ہو اُسے چھوڑنا اور اُن بے اختیار مخلوق اور ہستیوں کو اپنا معبود اور حاجت روا بنا لینا انہی نادانوں کا کام ہوسکتا ہے، جو عقل و بصیرت اور حق شناسی کے جوہروں سے بالکل ہی محروم ہوں۔

شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں[۳۴] اگر میں ایسا کروں تو میں تو کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ جاؤں گا[۳۵] میں تو ایمان لے آیا تمہارے رب پر تم بھی میری بات سُن لو۔[۳۶]

۳۴؎ یعنی تمہارے ان من گھڑت معبودوں کے اختیار اور قدرت میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ یہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور نہ کسی نقصان اور تکلیف سے بچا ہی سکتے ہیں، نفع اور نقصان کا اختیار تو صرف اللہ کو ہے اور اگر وہ خدائے رحمٰن جس سے مجھے رحم ہی کی امید ہے بالفرض مجھے کسی دکھ یا نقصان میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کرلے۔ اس دنیا میں یا اُس دُنیا میں۔ تو اس کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے مصیبت اُسی کے ٹالے ٹل سکتی ہے، تمہارے یہ معبود نہ تو خدا کے ایسے چہیتے اور لاڈلے ہیں کہ وہ ان کی سفارش بہر حال قبول ہی کرلے اور نہ یہ اس کے مقابلے میں ایسے زور آور ہیں کہ یہ مجھے اس کی پکڑ اور عذاب سے چھڑا ہی سکیں پھر آخر کس بنیاد پر میں اپنے اس حقیقی خدا کو چھوڑ دوں، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کے قدرت و اختیار میں سب کچھ ہے، جس نے مجھے حسین و جمیل جسم دیا، اور جس کے حضور سب کو ایک روز حساب دینے کے لئے حاضر ہونا ہے۔ اور ان بے بس معبودوں کی پرستش کرنے لگوں، جن کو نہ میری پیدائش میں کوئی دخل ہے، اور نہ نفع و نقصان پہنچانے ہی کا کوئی اختیار ہے ـــــ تم ہی سوچو بندگی کے لائق وہ خالق و مالک ہے جس کے قبضے میں سب کچھ ہے یا یہ جو خود مخلوق ہیں اور جن کے قبضے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

۳۵؎ یعنی ان روشن حقیقتوں کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی میں اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی بندگی کروں تو اس سے زیادہ کھلی ہوئی گمراہی اور کیا ہوگی۔ ایسی کھلی ہوئی گمراہی سے تو وہی آنکھیں بند کر سکتا ہے۔ جو آنکھوں کا بھی اندھا ہو اور دل کا بھی اندھا ہو، اور جو جانتے بوجھتے تباہی کے گڑھے میں گرنا ہی چاہتا ہو۔ حیرت ہے کہ تم ایسی کھلی گمراہی میں بتلا ہو، حقیقت پر غور کیوں نہیں کرتے۔ اتنی واضح بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی!

۳۶؎ یہ فقرہ اس مردِ مومن کی بصیرت و حکمت اور جراتِ ایمانی کا شاہکار ہے۔ بندۂ مومن دشمنانِ رسول

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ

(آخر کار ان ظالموں نے اس مردِ مومن کو قتل کر دیا تو) اس سے کہا گیا، کہ داخل ہو جا جنت میں ۳۲؎

اس نے کہا کاش کسی طرح میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ کس چیز کی بدولت میرے رب نے مجھے بخش دیا

کے درمیان اعلانِ حق کرتے ہوئے اور ان کو دلسوزی کے ساتھ حق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ میں ایمان لایا اپنے رب پر بلکہ کہتا ہے میں ایمان لایا تمہارے رب پر۔ یعنی وہ میرا ہی رب نہیں ہے تمہارا بھی رب ہے اور یہ اس کی شفقت و پرورش اور عالی ظرفی کی انتہا ہے کہ تم اس کا انکار کر رہے ہو اور وہ پھر بھی تمہاری تمام ضرورتیں پوری کر رہا ہے، کیسی عبرتناک نادانی میں تم مبتلا ہو کہ اس رب کی دی ہوئی قوتوں سے تم اسی کا انکار کر رہے ہو اسی کا پیغام ٹھکرا رہے ہو اور اسی کے بھیجے ہوئے نمائندوں کو قتل کرنے کے درپے ہو، اگر تم میں حق شناسی اور شکر گزاری کی کوئی بھی رمق ہو تو تمہیں اپنے رب پر ایمان لانا ہی چاہیئے۔ جو کچھ میں نے کیا ہے وہی تم کو بھی کرنا چاہیئے اور یہ افہام و تفہیم اور اعلانِ حق اُن ظالم اور خون کے پیاسے غضبناک لوگوں کے سامنے ہو رہا ہے، جو اس مردِ حق ہی کو نہیں بلکہ خدا کے رسولوں کو بھی سنگسار کرنے اور دردناک سزائیں دینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں، یہ جرأت ایمانی کا کرشمہ ہے، ورنہ جہاں موت سر پر منڈلا رہی ہو وہاں کوئی یہ جرأتِ گفتار نہیں دکھا سکتا، یہ بے خوفی وہی مردِ مومن دکھا سکتا ہے جس کے دل میں صرف ایک خدا کا خوف گھر کر گیا ہو۔

۳۲؎ یہ تیرہ بخت، مردِ مومن کا یہ اعلانِ حق برداشت نہ کر سکے، آپے سے باہر ہو گئے اور ان ظالموں نے اس کو شہید کر ڈالا۔ ادھر ان بدبختوں نے اُسے شہید کیا اور ادھر خدا کی طرف سے اُسے بشارت دی گئی کہ داخل ہو جاؤ جنت کی سدا بہار نعمتوں میں جنت تمہارا انتظار کر رہی تھی، قرآن پاک کا یہ بیان واضح انداز میں بتا رہا ہے کہ موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے بلکہ موت دوسری زندگی میں داخلے کا دروازہ ہے آنکھیں بند ہوتے ہی دوسری زندگی دیکھنے کے لئے آدمی کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، اس زندگی کی صورت حقیقت کیا ہوتی ہے، یہ خدا ہی جانتا ہے، البتہ اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد روح زندہ رہتی ہے، اہلِ عالم سے اس کا جذباتی تعلق بھی باقی رہتا ہے، اس کے احساسات بھی کام کرتے ہیں، اور

وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی قَوْمِہٖ مِنْ بَعْدِہٖ مِنْ جُنْدٍ

اور مجھے عزت واکرام والوں میں شامل کر لیا[۳۸] اور اس کے بعد ہم نے اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر

وہ پس ماندگان کی اچھائی برائی کے بارے میں سوچتی ہے، اور چاہتی ہے کہ ان کے بارے میں اس کی تمنائیں پوری ہوں اور یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد فوراً آدمی کا انجام اس کے سامنے آجاتا ہے، اور اس کی جزا یا سزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

۳۸ اس فقرے سے مومن کی ایک اور امتیازی خوبی سامنے آتی ہے۔ مومن کے دل میں خدا کے بندوں کے لئے بڑا پیار اور خلوص ہوتا ہے، وہ ان کا سچا ہمدرد اور سچا خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ اس قدر عالی ظرف اور بُردبار ہوتا ہے کہ اپنے ظالم قاتلوں کے لئے بھی اس کے دل میں کوئی جذبۂ انتقام اور کوئی کدورت نہیں ہوتی، وہ ان کے ہاتھوں سخت ترین ظلم سہہ کر بھی ان کا بھلا چاہتا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کی برائی اور کفر و شرک سے تو انتہائی نفرت کرتا ہے لیکن دشمنوں کی ذات سے اُسے پیار ہوتا ہے، وہ بُرے آدمی سے نفرت نہیں کرتا، بُرائی سے نفرت کرتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ خدا کے بندے معصیت اور گمراہی کی گندگی سے نکل کر پاکیزہ مومنانہ زندگی اختیار کر لیں، مومن اپنی جان کے دشمنوں کے لئے بھی یہی چاہتا ہے کہ کس طرح یہ جہنم سے بچ جائیں اور جنت کا راستہ اختیار کر لیں، اس مردِ مومن کے کمالِ اخلاق کی کوئی انتہا ہے۔ کہ مرنے کے بعد بھی اگر اس کی کوئی تمنا ہے تو یہ کہ میرے قاتل کاش یہ جان لیں کہ کس نعمت کو قبول کر لینے کی بدولت خدا نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت واکرام سے نوازا اور کاش وہ بھی اس نعمت کو قبول کر کے مغفرت اور عزت واکرام کے مستحق بن جائیں۔ اسی بندۂ صالح کی تعریف کرتے ہوئے خدا کے رسولؐ نے فرمایا ہے "نَصَحَ قَوْمَہٗ حَیًّا وَّمَیِّتًا"، اس شخص نے جیتے جی بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور مر کر بھی۔

قرآن پاک کی ان آیتوں میں مومن کا مثالی کردار پڑھ کر بے شک ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے اور روح وجد کرنے لگتی ہے۔ لیکن یہ پہلو بھی کبھی ذہن سے نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ یہ آیتیں ایک کسوٹی بھی ہیں، آخرت میں مغفرت و عزت اور خدا کی رضا چاہنے والے مومن کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اس کی زندگی میں ان اخلاق و اوصاف کی چھاپ کس حد تک ہے۔ اور ان خوبیوں سے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لئے وہ کس حد تک کوشاں ہے۔

مِنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿٢٨﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ ﴿٢٩﴾ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ

نہیں اُتارا اور نہ ہمیں لشکر اُتارنے کی کوئی حاجت ہی تھی[۳۹]۔ بس ایک (ہیبتناک) چیخ ہوئی اور یکایک سب بُجھ کر رہ گئے[۴۰]۔ افسوس ہے ان بندوں پر!

مشرکینِ مکہ کے سامنے اس مردِ صالح کا یہ کردار بیان کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخلص ساتھی تمہارے ایسے ہی سچے خیر خواہ ہیں، جس طرح یہ مردِ مومن اپنی قوم کا خیر خواہ تھا، تو کیا تم ان پاکیزہ نفوس کو ستا کر اس ہولناک انجام کو آواز دینا چاہتے ہو، جو اس قوم کا ہوا تھا۔ اور اسی طرح بھسم ہونا چاہتے ہو جس طرح یہ قوم بھسم کر دی گئی تھی۔ تم کھلی آنکھوں سے اپنے سچے خیر خواہ کو دیکھ رہے ہو، دیکھ رہے ہو کہ شب و روز وہ تمہاری بھلائی اور ہدایت کے لئے تڑپ رہے ہیں اور پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ آخر ان کو تم سے کیا لالچ ہے؟ یہ کیوں شب و روز تمہاری فکر میں گھل رہے ہیں، کسی قوم کی اس سے بڑی نادانی اور جہالت کیا ہوگی کہ وہ اپنے دشمن اور دوست کو پہچاننے کی تمیز ہی کھو دے، اور ان لوگوں پر ظلم و ستم کرنے لگے، جو دل سے اس کی بھلائی چاہتے ہیں۔

۳۹؎ یعنی اس مردِ مومن کے قتل کئے جانے اور رسولوں کی گستاخی کرنے کی پاداش میں جب خدا نے اس قوم کی ہلاکت اور تباہی کا فیصلہ فرمایا۔ تو اس کو تہس نہس کرنے کے لئے خدا نے آسمان سے کوئی فوج نہیں بھیجی ——— خدا کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ وہ ان کو نیست و نابود کرنے کے لئے آسمان سے فوج اُتارے ——— ان کی ہلاکت کے لئے تو بس فرشتوں کی ایک چیخ اور ایک دھماکہ کافی تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

۴۰؎ اوپر کی آیت میں کہا گیا تھا، کہ ان ظالموں کو ہلاک کرنے کے لئے ہمیں آسمان سے لشکر اُتارنے کی ضرورت نہ تھی، اسی بات کو پورا کرتے ہوئے اب کہا جا رہا ہے، کہ ان کو نیست و نابود کرنے کے لئے صرف ایک چیخ کافی تھی، چنانچہ ایک ہیبتناک چیخ نے ان کو بُجھا کر رکھ دیا۔ یہ ظالم و سرکش اپنے قوت و اقتدار کے گھمنڈ اور اپنے غیظ و غضب کے جوش میں ایسے بدمست تھے، کہ انھیں یہ حقیقت یاد ہی نہ رہی تھی، کہ خدا کے غضب اور عذاب کا ایک تھپیڑا انھیں ٹھنڈا کر کے رکھ دے گا۔ وہ سمجھتے تھے

مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ
مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝

ان کے پاس جو رسول بھی آئے یہ اُن کا مذاق ہی اُڑاتے رہے،[۴۴] کیا انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو تباہ کر چکے ہیں، پھر وہ کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہیں آئے[۴۵] اور ان سب کو ہمارے حضور حاضر کیا جانا ہے،[۴۶]

کہ ہمارے غیظ و غضب کے شعلے، ان کمزور حق پرستوں کو بھسم کر کے رکھ دیں گے اور یہ بھول گئے تھے کہ ان حق پرستوں کا حامی و ناصر وہ خدا ہے، جس کے مقابلے میں ان کی طاقت و قوت پانی کے ایک حقیر بلبلے سے بھی کم ہے۔

اس مختصر فقرے میں صرف اس دور کی کہانی ہی نہیں سنائی گئی ہے بلکہ اس میں رہتی دنیا تک کے لئے عبرت و نصیحت کا ایک دفتر ہے، حق پسندوں کے لئے تسلی اور استقامت کا سامان بھی ہے اور سرکش ظالموں کے لئے رُک کر سوچنے اور ہوش میں رہنے کا سامان بھی۔

کوئی دور ہو یہ حقیقت سامنے رہنا چاہیئے کہ جو لوگ حق پرستوں کی مخالفت کرتے ہیں یا ان کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ حق پرستوں کی مخالفت صرف چند سادہ لوح اور کمزور بندوں کی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے دین کی مخالفت ہے اور یہ جنگ براہِ راست کائنات کے خالق و مالک سے ہے، قوت و طاقت کے گھمنڈ اور جاہلانہ مخالفت کے جوش میں وہ بھول جاتے ہیں کہ ان حق پرستوں کو ستا کر وہ کس کے غضب کو بھڑکا رہے ہیں، وہ انھیں اپنی راہ کا روڑا سمجھتے ہوئے، انھیں پیس ڈالنا چاہتے ہیں، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس مختصر اور دنیوی ساز و سامان سے محروم گروہ کو کچل ڈالنا بہت آسان ہے، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں، کہ اس کمزور گروہ کا حامی و ناصر وہ خدا ہے جو قوت و عزت کا سرچشمہ ہے، جو سب پر غالب ہے، اور جس کی چٹکی میں پوری کائنات ہے، اس سے ٹکر لینے والا اس کی زمین پر زیادہ دیر نہیں ٹک سکتا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کب عذابِ الٰہی کی چیخ اُسے بھسم کر کے رکھ دے۔

[۴۴] منکرین کی اس گستاخی پر خدا کا اظہار افسوس اس لئے بھی ہے، کہ شاید ان کی آنکھیں کھل جائیں مگر در اصل یہ فقرہ مومن کی تسکین و تشفی کیلئے ہے "اُن سرکش گستاخوں کی یہ مستقل روش رہی ہے اور ہر

دور میں حق پیش کرنے والے محسنوں کے ساتھ یہی بُرا سلوک کیا ہے۔ مکّے کے گستاخ اگر محسنِ اعظمؐ کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں تو رسول کے جاں نثار دل تھوڑا نہ کریں، یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے، اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔ لیکن انجامِ کار حق کے دشمن اس طرح تہس نہس کر دیے جاتے ہیں، کہ کوئی ان کا نام لینے والا نہیں رہتا، اس کے برخلاف اہلِ حق کا ایک سلسلہ ہے جو انسانیت کی پیدائش سے اب تک چلا آرہا ہے اور رہتی زندگی تک چلتا رہے گا۔ آفتاب پر خاک پھینکنے والوں کی خاک خود انھیں پر آتی ہے۔ خدا نے جسے عزت دی ہے اور اپنے کام کے لئے منتخب کر کے اپنی نمائندگی کا عظیم منصب بخشا ہے وہ کسی کے ذلیل اور حقیر سمجھنے سے ذلیل و حقیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۴۲؎ یہ سُن رہے، اور دیکھ رہے ہیں، کہ رسولوں کا مذاق اُڑانے کا انجام کیا ہے، انسانی تاریخ انھیں بتا رہی ہے کہ ایسی سرکش اور گستاخ قومیں اس طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا، لیکن ان کی آنکھ نہیں کھلتی، خدا کے نمائندوں کو ستانا، اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنا وہ بدترین جرم ہے، جس کو کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا مگر افسوس کہ عیش و عشرت میں مدہوش اور قوت و اقتدار کے نشے میں بدمست قومیں تاریخ کے ان صفحات سے ذرا عبرت نہیں پکڑتیں۔ اور وہ اپنے اس عمل کو بار بار دُہراتی ہیں۔

۴۳؎ پھر وہ کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہیں آئے۔ یہ بڑا ہی عبرت انگیز جملہ ہے، تباہ و برباد ہونے والے پھر پلٹ کر نہیں آتے، ایک بار جو دنیا سے رخصت ہو گیا، پھر وہ واپس نہیں آتا، سوچنے سمجھنے اور اپنا انجام بنانے کی مہلت صرف ایک بار ہی ملتی ہے، فکر و عمل کی مہلت بار بار نہیں ملتی، یہی چند روزہ زندگی جو ملی ہے، یہی مہلتِ عمل ہے، فرد کے لئے بھی اور قوم کے لئے بھی، اپنا مستقبل بنانے اور بگاڑنے کا یہی ایک موقع ہے۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ ایک بار یہاں سے جانے کے بعد پلٹنے اور واپس آنے کا کوئی موقع نہیں۔ مہلتِ عمل کی سرحد موت ہے، موت کے بعد جزا اور بدلے کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ کس قدر نادان ہیں وہ افراد یا وہ قومیں جو چند روزہ زندگی کو محض رنگ رلیاں منانے میں گزاریں اور انجام کی ذرا فکر نہ کریں اور جو لوگ انھیں اس غلط زندگی کا عبرتناک انجام یاد دلائیں، ان کا شکر گزار ہونے کے بجائے یہ اُلٹے ان کو ستانے لگیں۔

۴۴؎ یعنی مرنے کے بعد واپس آنے کا کیا سوال اب تو سب کو خدا کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ﴿٣٣﴾
وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ﴿٣٤﴾
لِيَأْكُلُوا مِن ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٥﴾

اور[25] ان لوگوں کے لئے مُردہ زمین ایک نشانی ہے،[26] ہم نے اُسے زندگی بخشی، اور اس میں سے اناج اُگایا، جسے یہ کھاتے ہیں اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کئے۔ اور اس میں سے چشمے پھوڑ نکالے تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں، اور وہ چیزیں جو یہ اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں[27] پھر بھی یہ شکر ادا نہیں کرتے

جواب دینا ہے۔ اپنے کئے کرائے کا بدلہ پانا ہے اور اس خدا کو حساب دینا ہے، جس کی نگاہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، جو عدل و انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے گا۔ ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دے گا اور پھر اس کے فیصلہ کو کوئی نہ ٹال سکے گا۔ اس خدائی فیصلے کے بعد دو ہی انجام ہیں ـــــ دائمی انجام۔ یا ہمیشہ کا سکھ یا ہمیشہ کا دُکھ۔

٢٥ : پچھلی آیت میں یہ کہہ کر کہ "ان سب کو ہمارے حضور حاضر کیا جانا ہے" دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، ایک یہ کہ مرنے کے بعد ہر انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یہی عقیدۂ آخرت ہے اور دوسری حقیقت یہ کہ ایک خدا کے حضور سب کو حاضر کیا جائے گا۔ جو تنہا حساب لے گا۔ یہی عقیدۂ توحید ہے۔ یہی وہ دو بنیادی عقیدے تھے، جن کے باعث مکے میں کشمکش برپا تھی۔ انہی دو عقیدوں کو ذہنوں میں بٹھانے کے لئے پے در پے کائنات کی مختلف چیزوں سے دلائل دئے جا رہے ہیں اور متوجہ کیا جا رہا ہے، کہ نادانو! جن چیزوں کو شب و روز تم دیکھ رہے ہو، برت رہے ہو، اور جن سے برابر فائدہ اٹھا رہے ہو، ان پر غور کرو۔ ان میں سے ہر ہر چیز ان حقیقتوں کی تصدیق کر رہی ہے، جو خدا کے رسول تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

٢٦ : زمین کا لہلہا اٹھنا۔ پھر اس سے طرح طرح کے لذیذ پھل اور غلے اُگنا، اور زمین سے حسب ضرورت چشموں کا پھوٹنا اس حقیقت کی ایک واضح نشانی ہے، کہ یہ سب کچھ ایک ہی خدا کی قدرت، حکمت، تدبیر

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝

پاک و برتر ہے وہ ذات جس نے سب قسم کے جوڑے پیدا کئے،[۳۸] زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں میں بھی، خود انسانوں میں بھی، اور ان ساری چیزوں میں بھی جن کا انسان کو علم نہیں ہے۔ اور ان کے لئے ایک نشانی رات ہے،[۳۹] ہم رات پر سے دن کو کھینچ لیتے ہیں[۴۰] تو وہ گھپ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں

اور نظم کا کرشمہ ہے، اور شرک کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اور یہ اس حقیقت کی بھی واضح نشانی ہے کہ ایک روز خدا مُردوں کو دوبارہ زندگی عطا فرمائے گا۔ جس طرح وہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو زندگی بخشتا ہے اور وہ لہلہا اُٹھتی ہے۔

[۳۷] "اور وہ چیزیں جو یہ اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں"، اس سے مراد وہ ساری مصنوعی غذائیں، مٹھائیاں، مربے، اچار، چٹنیاں، بسکٹ، کیک، حلوے، مقویات اور دوسری چیزیں ہیں جو انسان اپنی مختلف ضرورتوں اور مزے کی خاطر قدرتی پیداوار سے تیار کرتا ہے، یہ بھی خدا کا احسان اور انعام ہی ہے کہ اس نے انسان کو ذوق بخشا، تلخی اور مٹھاس کا احساس دیا، اور یہ سوجھ بوجھ اور ہنر عطا فرمایا کہ وہ طرح طرح کی لذیذ، خوشنما اور مفید غذائیں تیار کرتا ہے۔ اس فقرے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں نے نہیں بنایا بلکہ سب کچھ خدا نے بنایا ہے۔

[۳۸] خدا نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے، زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں میں بھی ہر ایک کا جوڑا ہے، خود انسانوں میں بھی خدا نے مرد و عورت کا جوڑا بنایا ہے، اور ان مخلوقات میں بھی ہر ایک کا جوڑا ہے جن کا انسان کو علم نہیں ہے۔

انسانوں میں مرد و عورت کا جوڑا تو خود انسان کی اپنی پیدائش کا سبب ہے، دوسرے جانداروں کی پیدائش اور توالد میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ زمین سے پیدا ہونے والے درخت، پیڑ پودے، پھل ترکاریاں، میوے، غلے وغیرہ سب ہی میں نر و مادہ کے جوڑ اور اختلاط کی کارفرمائی ہے۔ اور ان کے باہمی تعلق اور جوڑ سے افزائش و پیدائش کے لئے خدا نے جو قدرتی انتظامات فرمائے ہیں وہ انتہائی حیرت انگیز بھی ہیں اور نہایت ایمان افروز بھی، اس کے بارے میں بہت کچھ علم انسان کو ہو چکا ہے اور ڈھیرے ڈھیرے مزید انکشافات ہو رہے ہیں، جنھیں جان کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور پھر یہ جوڑا اور ملاپ کا

معاملہ صرف نباتات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بے جان مادوں میں بھی یہی اصول جاری ہے۔ ہر چیز کا خدا نے جوڑا پیدا کیا ہے، اور ہر چیز میں اپنے جوڑے کے لئے غیر معمولی کشش اور حیرت انگیز مناسبتیں رکھی ہیں، ہر چیز اپنے جوڑے سے ملنا چاہتی ہے اور باہم ملنے سے ہی وہ نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ کوئی چیز اپنے جوڑے سے ملے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتی اور دنیا میں اسی اختلاط، امتزاج اور باہمی تعلق وجوڑ سے نئی نئی چیزیں وجود میں آرہی ہیں، نئے نئے مرکبات سامنے آرہے ہیں، گوناگوں ایجادات ہو رہی ہیں، بجلی میں ایک رو مثبت ہے اور ایک منفی، یہ ایک دوسرے کا جوڑ ہیں اور ان کی باہمی کشش اور تعلق ہی سے ایسے ایسے کرشمے سامنے آرہے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ـــــ جو کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے ان میں اللہ تعالی نے جو ان گنت جوڑے بنائے ہیں اور پھر ان کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے، ان کی ساخت، ان کی باہمی مناسبت، اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے اور اثر قبول کرنے اور ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہونے کے جو کرشمے پھیلا رکھے ہیں، انہی کو پوری طرح سمجھنا اور ان کی حقیقت کا پورا پورا علم حاصل کرنا آسان نہیں ہے، حالانکہ کائنات کی کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں، جن کا انسان کو علم ہی نہیں ہے، اور بہت سی وہ چیزیں بھی ہیں، جن کا علم اگرچہ انسان کو ہے لیکن ان میں باہم اختلاط اور جوڑ کا کیا اصول کارفرما ہے، انسان کو اس کا علم نہیں ہے۔ یہ حیرت انگیز کائنات اور اس میں کار فرما یہ بصیرت افروز قانونِ تزویج انسان کو جھنجھوڑتا ہے۔ کہ وہ غور کرے اور اس سے سبق حاصل کرے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذاریات ۴۹)	اور ہم نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں اس سے نصیحت و یاد دہانی ہو۔

کائنات کی ساری رونق و بہار اور دنیا کی گوناگوں نعمتیں جن سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے اور ہمہ وقت لطف اندوز ہو رہا ہے وہ اسی قانونِ تزویج کے نتائج و برکات ہیں۔ ان کی طرف متوجہ کرنے کا مقصود یہ ہے کہ آدمی اندھا بہرہ اور بے شعور بن کر ان سے فائدہ نہ اٹھائے۔ بلکہ ان سے سبق حاصل کرے، خدا کی یہ حکمت اور اس سے رنگا رنگ نعمتوں کی پیدائش اسی لئے ہے کہ "تمہیں اس سے نصیحت و یاد دہانی ہو"۔

زیرِ غور آیت میں قانونِ تزویج اور ہر چیز کے زوج زوج ہونے کی بات اس لئے بیان کی گئی ہے کہ آدمی اس پر غور کرے اور اس سے حقیقت کو پانے کی کوشش کرے۔ یہاں اس آیت میں بیک وقت دو حقیقتوں کی طرف ذہن کو متوجہ کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ کائنات میں ہر چیز کا زوج زوج پیدا کرنا اور پھر

ہر چیز کا اپنے جوڑے کے لئے غیر معمولی کشش، زبردست مناسبتیں، اور پھر دونوں کے ملاپ اور اختلاط کو نتیجہ خیز بنانا نہ تو کوئی اتفاقی حادثہ ہے اور نہ چند ہستیاں مل کر یہ سب کچھ کر رہی ہیں یہ سب ایک بااختیار حکیم اور کامل قدرت والا خدا تنہا کر رہا ہے۔ جو ہر عیب، ہر نقص ہر کمزوری اور ہر کمی سے پاک ہے، دوسرے کی شرکت اور مدد کی ضرورت اس کو ہوتی ہے، جس کا علم ناقص ہو، جس کی قدرت قوت میں کوئی کمی ہو، جس میں کوئی عیب یا کمزوری ہو، خدا اس طرح کی تمام کمزوریوں اور عیبوں سے پاک ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا، پاک و برتر ہے وہ ذات جس نے سب قسم کے جوڑے بنائے۔

پھر اس کائنات میں ہر چیز کا جوڑا جوڑا ہونا، ایک ایسی حقیقت ہے جو اس بات کی بھی ایک واضح شہادت ہے کہ آخرت یقینی ہے۔ آدمی عقل و فکر سے کام لے تو وہ آسانی سے اس نتیجہ تک پہونچ سکتا ہے کہ دنیا میں جب ہر چیز کا جوڑا ہے تو آخر انسانی زندگی کا جوڑا کیوں نہیں ہے۔ اس زندگی کا جوڑا لازماً آخرت کی زندگی ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے، آخرت کی زندگی نہ ہو تو یہ دنیا کی زندگی قطعی بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی اور حکیم و علیم خدا کی ذات سے بالکل بعید ہے کہ وہ کوئی بے نتیجہ کام کرے۔

۹ شب و روز کی آمد و شد کا منظر آدمی روز دیکھتا ہے، مگر کم ہی لوگ سنجیدگی سے اس گردش لیل ونہار پر غور کرتے ہیں، قرآن کا ارشاد ہے کہ رات ایک نشانی ہے، یعنی یہ کسی حقیقت کی یاددہانی کا سامان ہے ہوشمندوں کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ رات دن کی اس گردش میں اپنی عمر کے لمحات پورے کرتے رہیں اور یہ نہ سوچیں کہ یہ کس انجام کی طرف ہمیں متوجہ کر رہی ہے۔

روز سورج طلوع ہو کر اپنی زبردست آب و تاب سے کرۂ ارض کو جگمگا دیتا ہے۔ جوں جوں یہ اوپر آتا جاتا ہے، زندگی کی ہماہمی بڑھتی جاتی ہے۔ زمین پر روشنی کی پھیلنے والی چادر روشن تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور دنیوی زندگی کی چہل پہل میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، مگر چند ہی گھنٹوں کے بعد سورج ڈھلنے لگتا ہے، افق سے شام کی سیاہی نمودار ہونے لگتی ہے، روشنی کی پھیلی ہوئی چادر دھیرے دھیرے سمٹنے لگتی ہے، گویا اُسے کوئی زمین پر سے کھینچ کر لپیٹ رہا ہے اور نیچے زمین کی تاریکی بڑھتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ روشنی بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ اور مخلوق خدا بالکل تاریکی رہ جاتی ہے۔ یہ منظر روز انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور عمر عزیز کا ایک دن پورا کر کے نیند کی گود میں غافل

پڑ رہنا ہے، قرآن متوجہ کرتا ہے، کہ یہ ایک نشانی ہے۔ یہ تمہیں روز یاد دلاتی ہے کہ تمہاری زندگی کا بھی یہی انجام ہے۔ زندگی کا سورج نمودار ہوتا ہے، زندگی کی چہل پہل شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ زندگی کا دن شباب پر پہنچ جاتا ہے، آدمی شباب کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے، دنیا بنانے اور زیادہ سے زیادہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے منصوبے بناتا ہے، اور دنیا سمیٹنے کی فکر میں جٹ جاتا ہے کہ زندگی کا سورج ڈھلنے لگتا ہے، زندگی کی شام نمودار ہونے لگتی ہے، شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھنے لگتا ہے اور آخر کار زندگی کا سورج ڈوب جاتا ہے۔ یہ اس زندگی کا انجام ہے جو ایک ہی بار ملتی ہے اور اس کا سورج جب ایک بار ڈوب جاتا ہے تو پھر اس دنیا میں کبھی دوبارہ طلوع نہیں ہوتا۔

ٹھیک یہی انجام اس پوری دنیا کی زندگی کا ہے، یہ شب و روز کی گردش دنیا کو اپنے انجام سے قریب کر رہی ہے ایک دن دنیا کی زندگی پر بھی شام کی تاریکی چھانے لگے گی، یہ ساری ہماہمی، اور رونق ختم ہو جائے گی۔ زندگی کی یہ ساری بہاریں ناپید ہو جائیں گی ــــ اور یہ سارا کارخانۂ عالم فنا کے سناٹے میں کھو جائے گا پھر ایک نئی صبح نمودار ہو گی، نیا آسمان ہو گا، نئی زمین ہو گی اور سارے انسان اپنی زندگی کا انجام دیکھنے کے لئے اپنے رب کے حضور بے نقاب کھڑے ہوں گے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (ابراہیم ۴۸-۵۱)

یاد کرو اس دن کو جب کہ زمین کسی دوسری زمین میں بدل دی جائے گی اور سارے آسمان بھی، اور تمام انسان اللہ واحد و قہار کے حضور بے نقاب حاضر ہو جائیں گے۔ اس دن تم تمام مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے وہ تارکول کا لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہرے پر چھا رہے ہوں گے یہ اس لئے کہ اللہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دے گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔

پھر یہ رات دن کی آمد و رفت اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے، کہ زمین سورج کے سامنے آتی ہے

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ؕ

اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف برابر چلا جا رہا ہے ۵۱۔ یہ ایک زبردست علیم والے کا باندھا ہوا حساب ہے ۵۲

تو دن ہو جاتا ہے، سامنے سے ہٹتی ہے تو روشنی ختم ہو جاتی ہے اور رات چھا جاتی ہے اور یہ دونوں انسان کی ساری فطری اور طبعی ضرورتیں پورا کرتی ہیں، سورج، زمین اور دوسرے کُرے ایک خاص حکمت، اندازے اور لگے بندھے نظم کے تحت چل رہے ہیں۔ یہ سارا نظم ایک ہی ہستی کے حکم کے تحت چل رہا ہے۔ اور ایک ہی کے حکم کے تحت چل سکتا ہے۔ کوئی ایک کرہ بھی ایک لمحے کے لئے کسی اور کے حکم پر چلے یا حقیقی حاکم کے حکم سے سرتابی کرے تو یہ سارا کارخانہ ہست و بود درہم برہم ہو جائے۔ اس طرح رات بیک وقت آخرت کے وجوب پر بھی بہترین شہادت ہے، اور خدا کی توحید کی بھی روشن دلیل ہے۔

۵۰ "رات پر سے دن کو کھینچ لیتے ہیں" قرآن نے سلخ کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے معنے ہوتے ہیں جانور کی کھال اُتارنا اور سانپ کا کینچلی سے نکلنا، اس اندازِ بیان سے دنیا کی مثال یہ معلوم ہوتی جیسے ایک تاریک گھر ہو جس میں گھپ اندھیرا ہو، اس میں جب بلب روشن کر دیا جائے تو وہ روشن ہو جائے اور جوں ہی بلب بجھا دیا جائے تو پورا گھر تاریکی میں ڈوب جائے، پھر یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے کہ یہ سورج اس کرۂ ارض کو صرف روشنی ہی نہیں دیتا، زمین پر جو زندگی پائی جاتی ہے، وہ بھی سورج ہی کے دم سے ہے، سورج اگر ایک مقررہ فاصلے پر نہ ہوا اور وہ اگر ایک خاص اور مناسب مقدار میں زمین کو اپنی گرمی منتقل نہ کرتا رہے تو اس سرزمین پر نہ کوئی جاندار زندہ رہ سکتا ہے اور نہ یہاں نشو و نما کی قوتیں باقی رہ سکتی ہیں۔ زمین اور سورج کا یہ ربط اور اس سے پیدا ہونے والے شب و روز بتاتے ہیں کہ فضا میں گردش کرنے والے سارے سیارے اور پورا نظام شمسی ایک ہی نظم میں جکڑے ہوئے ہیں اور سب مل کر ایک ہی آرڈر کی تعمیل کر رہے ہیں۔ شب و روز کی اس گردش میں کسی اور کو قطعاً دخل نہیں ہے خدا کا ارشاد ہے۔

" اے نبیؐ ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لئے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے پوچھو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کیلئے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کر و اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

۵۱ ؎ "سورج اپنے ٹھکانے کی طرف برابر چلا جارہا ہے" اس مختصر فقرے میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ سورج برابر ایک مقررہ رُخ پر چلا جارہا ہے۔ خدا نے اس کے لئے جو راہ ہموار کر رکھی ہے، وہ اس پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ مصروفِ سفر ہے، نہ کبھی اپنی مقررہ راہ سے ایک لمحہ کے لئے ہٹتا ہے اور نہ کبھی رکتا ہے۔ بلکہ برابر گردش کر رہا ہے۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ یوں واضح کیا گیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَیْنِ " اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ دونوں برابر اپنی راہ پر چلے جارہے ہیں"

ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں جس ڈیوٹی پر خدا نے انھیں لگا دیا ہے۔ ایک فرمانبردار غلام کی طرح وہ برابر اسے انجام دیئے جارہے ہیں

دوسری حقیقت یہ ہے کہ سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے۔ یعنی اس کی یہ گردش اور دوڑ ایک ایسے ٹھکانے کی طرف ہے، جہاں آخر کار ایک دن سورج کو پہنچ کر اپنا سفر ختم کر دینا ہے۔ ٹھکانے سے مراد وہ مقام بھی ہو سکتا ہے جہاں آخر کار ایک روز سورج پہنچ کر رک جائے گا — اور ٹھکانے سے مراد وہ وقت بھی ہو سکتا ہے، جب سورج ٹھیر کر برباد ہو جائے گا۔ قرآن میں جگہ جگہ اس وقت کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اور یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ نظام عالم آخر کار ایک دن درہم برہم ہو جائے گا۔

۵۲ ؎ "یہ ایک زبردست اور علم والے کا باندھا ہوا حساب ہے" یعنی سورج کی یہ گردش خود بخود نہیں ہے اور نہ یہ یونہی اتفاقی ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی ہستی کے باندھے ہوئے حساب میں جکڑا ہوا ہے، جس کی دو صفتوں کو ذہن میں رکھ سورج کی سیر و گردش پر غور کرنا چاہیئے۔

پہلی صفت یہ کہ وہ زبردست ہے یعنی سب پر غالب ہے، اپنے بنائے ہوئے نظام پر پورا پورا قابو رکھتا ہے اور اس کا نظام صرف اسی کے قابو میں ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے نظام میں دخل دے سکے، اس کے باندھے ہوئے حساب میں کوئی خلل ڈال سکے، کسی میں یہ طاقت نہیں کہ سورج کو اپنی راہ سے لمحہ بھر کے لئے ہٹا سکے یا روک سکے، اس زبردست اور غالب ہستی نے اس کے لئے جو راستہ مقرر کر رکھا ہے وہ کسی روک ٹوک کے بغیر نہایت پابندی سے اس پر برابر چل رہا ہے اور چلتا رہے گا یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب اسی کے حکم سے یہ اپنا سفر ختم کر دے گا اور

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ
اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور چاند ہم نے اس کے لئے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں یہاں تک کہ وہ ان سے گزرتا ہوا پھر کھجور کی شاخ[۵۳] کی مانند ہو جاتا ہے[۵۴]۔ نہ تو سورج ہی کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں[۵۵]۔

رُک جائے گا۔

اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ علم والا ہے۔ لہٰذا یہ گردش وسیر اندھا دھند نہیں ہے۔ گردش کرانے والا ایک ایک پل سے واقف ہے، ایک ایک لمحے کی گردش اور ایک ایک منزل اس کے علم میں ہے۔ فضا میں لاتعداد کروں کی گردش اس کے علم میں ہو رہی ہے ___ ممکن نہیں کہ کسی کی رفتار کسی کے خلاف پڑ سکے، کوئی کسی سے ٹکرا سکے یا کسی کی گردش اس کے بنائے ہوئے مجموعی منصوبے کے خلاف پڑ سکے۔ ایک ایسی زبردست، با اختیار، اور علم والی ہستی کی نگرانی میں چلنے والا یہ کارخانہ بے مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ اختیارات والی ہستیاں اس نظم کو چلا رہی ہوں، ___

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ (الانعام ۹۶)	اسی نے سورج اور چاند (کے طلوع وغروب) کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ اسی زبردست اور علم والے کا ٹھیرایا ہوا اندازہ ہے۔

سورہ حٰم سجدہ میں، زمین و آسمان کی تخلیق، ان کے تدبیر و انتظام اور فضا کے کروں کا تذکرہ کرنے کے بعد بھی آخر میں یہی فقرہ آیا ہے ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ. دراصل ان دو صفات پر آدمی جہاں تک غور کریگا، اس پر یہ حقیقت کھلتی چلی جائے گی کہ اس کائنات میں صرف ایک ہی خدا کا حکم چل رہا ہے۔ اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی بنائی ہوئی یہ کائنات یقیناً با مقصد ہے اور یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کائنات کی سب سے اشرف مخلوق کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔

۵۳ عرجون، کھجور کا گچھا کاٹنے کے بعد جو ڈنڈی رہ جاتی ہے اس کو عرجون کہتے ہیں، یہ ڈنڈی پرانی ہو کر سوکھنے کے بعد کمان کی طرح ٹیڑھی ہو کر رہ جاتی ہے چاند بھی مہینے کے آخر میں بالکل اسی ڈنڈی کی طرح باریک

خمدار اور بے رونق سا ہو کر رہ جاتا ہے، یہ تشبیہ ادبیت اور تفہیم کا شاہکار ہے۔

۵ رات اور سورج کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد اب چاند کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ سورج کو آیۃ النہار یعنی دن کی نشانی کہا گیا ہے اور چاند کو آیۃ اللیل یعنی رات کی نشانی کہا گیا ہے۔ دراصل یہ دونوں ہی کرے انسان کو روشنی وغیرہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ ماہ و سال کا حساب متعین کرنے کے ذرائع بھی ہیں، خدا کا ارشاد ہے۔

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا (انعام) — اور سورج اور چاند کو حساب کے ذرائع بنایا

دوسرے مقام پر اور زیادہ واضح انداز میں فرمایا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ — یونس

وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو چمکتا بنایا اور اس کے لئے منزلیں مقرر کیں۔ تاکہ تم اس سے برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو۔

سورج دن کو نمودار ہو کر ہر چیز کو روشن کر دیتا ہے، اور اسی کے طلوع و غروب اور گردش سے شب و روز کی گردش ہو رہی ہے۔ سردی اور گرمی کے موسموں کی الٹ پھیر ہو رہی ہے اور آدمی ماہ و سال کا حساب معلوم کر رہا ہے، پھر اسی کے ساتھ شب میں چاند نمودار ہوتا ہے، مہینہ کی پہلی تاریخ کو وہ ایک باریک ہلال ہوتا ہے، پھر دھیرے دھیرے اس کا گھیر اٹھتا ہے، اور اسی کے ساتھ اس کی روشنی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ چودھویں رات کو اس کی روشنی عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے چاند کا گھیر اکم ہوتا جاتا ہے، اور روشنی بھی مدھم پڑتی جاتی ہے، یہاں تک کہ چاند کھجور کی سوکھی ڈنڈی کی طرح خمدار، باریک اور بے رونق ہو کر رہ جاتا ہے۔ سورج سے شب و روز کی گردش قائم ہے۔ اور انسان شب و روز سے مناسب فائدے اٹھا رہا ہے، اور چاند کی مدد سے یہ معلوم کرتا ہے کہ آنے والی شب مہینہ کی کونسی شب ہے مہینہ کے کتنے دن گذر گئے اور کتنے باقی ہیں اور کب نیا چاند آسمان کے مطلع پر نمودار ہو کر [illegible] کی نوید لائے گا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں کہو یہ لوگوں کے لئے تاریخ کی تعیین اور حج کی علامتیں ہیں۔

پھر چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتیں، اس کی کم بیش ہونے والی دلکش روشنی کا دلنواز منظر اس قدر واضح اور کھلا ہوا ہے کہ ہر شخص عالم ہو یا ان پڑھ، بستی میں ہو یا صحرا میں، خشکی میں ہو یا سمندر میں بڑی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ مہینے کی کونسی تاریخیں ہیں، مہینے کا کتنا حصّہ گزر گیا اور کتنا باقی ہے، پھر یہ حسین منظر انسان اس وقت سے اسی طرح دیکھتا چلا آرہا ہے جب سے انسانی تاریخ اس کرے پر شروع ہوئی ہے پھر صدیاں گزر گئیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نہایت منظّم، مرتب اور مسلسل نظم میں کبھی کوئی خلل یا خرابی یا تغیّر پیدا ہوا ہو — صدیوں سے اس نظام کی یہ حیرت انگیز باقاعدگی ہر ذی ہوش کو یقین دلاتی ہے کہ یہ نظم نہ تو خود بخود قائم ہو سکتا ہے، اور نہ یہ بے مقصد ہو سکتا ہے۔ پھر یہ انسان جو اس چاند کے نظم سے ماہ و سال کا حساب معلوم کر رہا ہے اپنی عبادات اور تقریبات کے ایّام معلوم کر رہا ہے اور اس طرح اپنی زندگی کے مقرّرہ ایام پورے کر رہا ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی بے مقصد ہو، اگر چاند کو غروب کرنے کے بعد اس کا خالق دوبارہ طلوع کر دینے پر قادر ہے، تو آخر انسان کو دوبارہ پیدا کر دینے پر قادر کیوں نہیں ہے۔

چاند کے لئے خدا نے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں اور چاند ہر مہینے ان منزلوں سے گزرتا ہے۔ اس کی گھٹتی بڑھتی خوشنما شکلوں اور اس کی کم و بیش ہوتی دلکش روشنی سے انسان محظوظ ہوتا ہے۔ اوقات اور تاریخوں کی تعیین کرتا ہے۔ حج وغیرہ کی تاریخیں، رمضان اور عید کی برکتوں اور خوشیوں کے ایام معلوم کرتا ہے۔ اور اس طرح چاند کی مسلسل گردش کے ساتھ گزرتے شب و روز میں زندگی کی مقررہ مہلت پوری کرتا ہے۔ اور ہر ماہ یہ سبق آموز منظر دیکھتا ہے کہ چودھویں کا بدرِ کامل کرۂ ارض کو تاحدِ نظر بقعۂ نور بنا دیتا ہے مگر آخر کار وہ ایک دن نہایت نحیف، خمیدہ، بے رونق اور بے نور ہو کر غروب ہو جاتا ہے، انسانی زندگی بھی شباب کی بھرپور قوتوں سے تہلکہ مچا دیتی ہے، مگر آخر کار یہ زندگی نحیف، خمیدہ بے رونق اور بے سکت ہو کر موت کی آغوش میں غروب ہو جاتی ہے تو کیا اس کا انجام بس یہی ہے؟

۵۵ اس آیت میں دراصل یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا نے سورج اور چاند کے لئے جو نظم مقرر کر رکھا ہے وہ نہایت مستحکم اور نہایت ہی حکیمانہ ہے، ممکن نہیں کہ اس میں ذرا خلل واقع ہو سکے، خدا نے ہر کرے کے لئے جو راستے، جو منزلیں، جو رفتار اور گردش کے جو دائرے مقرر کئے ہیں، مجال نہیں کہ وہ ایک سکنڈ کے لئے بھی ان سے ہٹ سکیں، یا آگے پیچھے ہو سکیں، اس پورے نظام میں باہمی موافقت ہے، باہمی تعاون ہے، اور سب مل کر اس نظام کو مفید اور نتیجہ خیز بنائے ہوئے ہیں نہ تو سورج کے

وَ اٰیَةٌ لَّھُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَھُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَ خَلَقْنَا لَھُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ
مَا یَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْھُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَھُمْ وَ لَا ھُمْ یُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً
مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ ﴿۴۴﴾

اور ان کے لئے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا [۵۶]
اور ان کے لئے ویسی ہی سواریاں پیدا کیں [۵۷] جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو
ان کو غرق کر دیں، پھر کوئی نہ ان کا فریاد رس ہو گا اور نہ کسی طرح یہ بچائے جاسکیں گے۔
پس یہ ہماری رحمت ہی سے پار لگتے ہیں اور ایک خاص مدت تک زندگی کا سامان پاتے ہیں [۵۸]۔

بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ یہی ممکن ہے کہ دن روشن ہو اور یکایک رات اُسے ڈھانپ لے۔ ہر کُرہ اپنے اپنے دائرے میں مقرر کئے ہوئے نظم اور مقرر کئے ہوئے اندازے سے گردش کر رہا ہے۔ نہ کوئی کسی سے ٹکراتا ہے، نہ کوئی کسی کی راہ روکتا ہے نہ کوئی کسی کے نظم میں خلل ڈالتا ہے۔ اور نہ کوئی اپنی گردش میں کوتاہی کرتا ہے۔ نہ رات کے لئے ممکن ہے کہ وہ یکایک دن میں آنمودار ہو اور نہ دن کے امکان میں یہ ہے کہ آدھی شب کو تاریکی کا پردہ چاک کر کے یکایک اپنی روشنی پھیلا دے اور نہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کھلی ہوئی وسیع فضا میں یہ تیز رفتار سیارے ایسی بے ہنگم چال چلیں کہ کبھی یہاں ٹکرائیں اور کبھی وہاں۔ یہ عظیم الشان اور حیرت انگیز نظم جو ذی ہوش بھی دیکھے گا بے اختیار پکار اُٹھے گا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۔ یہ ایک نہایت زبردست حکمت والے کا باندھا ہوا حساب ہے۔

۵۶ بھری ہوئی کشتی سے مراد وہ تاریخی کشتی ہے جو نوح علیہ السلام نے اللہ کی نگرانی میں تیار کی تھی، سورۃ شعرا آیت ۲۶ میں اس کشتی کو بھری ہوئی کشتی کہا گیا ہے۔ طوفانِ نوح کے وقت اہل ایمان کو اور دوسرے جانداروں کو بچانے کے لئے اس میں بھر دیا گیا تھا، اس لئے اس کو بھری ہوئی کشتی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ	یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور وہ تنور
التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْھَا مِنْ	اُبل پڑا تو ہم نے کہا ہر قسم کے جانداروں کا
كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَھْلَكَ	ایک ایک جوڑا کشتی میں بٹھا لو، اور اپنے گھر

اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ وَمَنۡ اٰمَنَ ؕ

والوں کو۔ سوائے ان کے جن کے لئے ہمارا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اس میں سوار کرادو، اور اُن لوگوں کو بھی جو ایمان لے آئے ہیں۔

یعنی اس کشتی میں حضرت نوحؑ اُن کے گھر کے لوگ، دوسرے اہلِ ایمان، اور ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا سوار کرا دیا گیا تھا، اس لئے خدا نے اس کو بھری ہوئی کشتی کہا ہے۔ یہ کشتی خدا کی رحمت و عنایت کی ایمان افروز نشانی اور خدا کے فضل و احسان کی دائمی یادگار ہے۔ خدا کا ارشاد ہے۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰکُمۡ فِی الۡجَارِیَۃِ ۙ لِنَجۡعَلَہَا لَکُمۡ تَذۡکِرَۃً وَّ تَعِیَہَاۤ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ

(نوح ۱۱، ۱۲)

جب پانی میں طوفان اُٹھا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا۔ تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لئے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اسے محفوظ رکھیں۔

خدا کے فضل و احسان اور رحمت و عنایت کی دائمی یادگار کی اہمیت و عظمت کا صحیح احساس کرنے کے لئے اس عظیم طوفان کا تصوّر کیجئے جب آسمان بے تحاشا برس رہا تھا، زمین سے پانی اُبل پڑا تھا، اور ہر طرف وہ زبردست طوفان تھا کہ پانی میں پہاڑ جیسی اونچی اونچی موجیں اُٹھ رہی تھیں اور کرۂ ارض پر کہیں بھی انسان کے لئے جائے پناہ نہ رہ گئی تھی، اس قیامت خیز طوفان میں صرف یہی کشتی تھی، جس میں چند اہلِ ایمان خدا کے عذاب سے محفوظ تیر رہے تھے۔

وَهِیَ تَجۡرِیۡ بِہِمۡ فِیۡ مَوۡجٍ کَالۡجِبَالِ ۟

اور وہ کشتی ان لوگوں کو لئے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی مانند اُٹھ رہی تھی۔

زمین و آسمان مل کر عذابِ الٰہی کے اس منصوبے کو کس طرح پورا کر رہے تھے۔ اس کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

فَفَتَحۡنَاۤ اَبۡوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنۡہَمِرٍ ۫ۖ وَّ فَجَّرۡنَا الۡاَرۡضَ عُیُوۡنًا فَالۡتَقَی الۡمَآءُ عَلٰۤی اَمۡرٍ قَدۡ قُدِرَ ۚ

پھر ہم نے آسمان کے دروازے کھول دئے۔ لگاتار پانی گرنے لگا۔ اور ہم نے زمین کو پھاڑ دیا کہ ہر طرف چشمے پھوٹ پڑے۔ پھر یہ دونوں طرح کے پانی اس منصوبے کو پورا کرنے کے

(القمر ۱۱، ۱۲) لئے باہم مل گئے جوڑ کر دیا گیا تھا۔

ایسے قیامت انگیز طوفان میں خدا نے چند نفوس کو غرق ہونے سے بچایا، اور یہ نفوس وہی تھے جو نوحؑ کے ساتھ اس کشتی میں سوار تھے۔ دراصل یہی کشتی تھی جس کے ذریعے روئے زمین پر نسلِ انسانی باقی ہے ورنہ طوفان میں آدم کی پوری نسل غرق کر دی گئی۔ بعد کی نسلِ انسانی انہی چند نفوس سے چلی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کشتی رحمتِ الٰہی کی زبردست نشانی ہے۔ اور اسی حیثیت سے قرآن بار بار اس کا تذکرہ کرتا ہے۔

۵۷ھ اس سے مراد وہ کشتیاں بھی ہیں جو بعد میں انسانوں نے سمندری سفر کے لئے بنائیں اور وہ سواریاں بھی مراد ہیں، جن پر انسان خشکی میں سوار ہوتا ہے۔ مثلاً اونٹوں کو اہلِ عرب "سفائن البر"، "خشکی کی کشتیاں" کہا کرتے تھے، اور ان تمام سواریوں کی طرف بھی اشارہ ہے، جو انسانوں نے بعد میں ایجاد کیں اور برابر ایجاد کرتے رہیں گے۔

۵۸ھ ان دو آیتوں میں دراصل انسان کو یہ تنبیہ اور تذکیر کی گئی ہے کہ فطرت کی جن عظیم قوتوں پر انسان کو تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔ اور ان سے فائدہ اٹھانے کی جو سوجھ بوجھ عطا کی گئی ہے یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے۔ یہ حیرت انگیز سوجھ بوجھ اور فطرت کی زبردست طاقتوں پر تصرف کا اختیار پا کر انسان اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو، کہ اُسے فطرت کی قوتوں پر کامل غلبہ حاصل ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کا غلبہ محدود ہے اور اسی وقت تک ہے جب تک اللہ چاہے ورنہ وہی چیزیں جو انسان کی تابع فرمان بن کر انسان کو فائدہ پہنچاتی ہیں، خدا کی مرضی نہ ہو تو وہی دم بھر میں پوری کی پوری بستیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہیں، اس لئے انسان کے لئے نہ یہ رویہ صحیح ہے کہ وہ اپنے تصرف و اختیار پر گھمنڈ کرنے لگے اور نہ یہی صحیح ہے کہ وہ فطرت کی ان عظیم طاقتوں سے مرعوب ہو کر خود انہی کے سامنے جبینِ نیاز و عقیدت جھکانے لگے۔ طاقت و قدرت عظمت و اقتدار کا مالک صرف وہ خدا ہے جس نے کائنات کی ان عظیم قوتوں کو پیدا کیا۔ اسی کے حکم سے یہ انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں، نہ انسان کو ان پر کامل تصرف کا اختیار ہے۔ اور نہ خود ان کا اپنا کوئی اختیار ہے۔ حکم اور اختیار صرف خالقِ کائنات کا حق ہے۔ اگر وہ انسان کو ان بپھری موجوں میں غرق کرنے کا فیصلہ کر لے تو کائنات میں کوئی طاقت نہیں جو انسانوں کی فریاد رسی کر سکے یا اس کو ان غضبناک موجوں کے چنگل سے چھڑا سکے، ہاں وہ خود ہی ان پر رحم فرمائے اور زندگی کی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٤٥﴾ وَمَا
تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٤٦﴾

اور جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ اس انجامِ بد سے ڈرو جو تمہارے آگے آرہا ہے اور جو تمہارے پیچھے گزر چکا ہے[٥٩] تاکہ تم پر رحم کیا جائے[٦٠] (تو وہ توجہ ہی نہیں کرتے[٦١]) اور ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے یہ اس سے بے رُخی برتتے ہیں[٦٢]

کچھ اور مہلت دے دے مگر بہر حال یہ مہلت ایک دن ختم ہوگی اور انسان کو ایک دن اس مہلتِ عمل کی جواب دہی اپنے خالق کے حضور لازماً کرنی ہوگی۔

٥٩ "پیچھے گزر چکا ہے"، یعنی اس قہر و غضب اور عتاب و عذاب سے عبرت پکڑو۔ جو تم سے پہلے ان مجرموں کو تباہ و برباد کر چکا ہے۔ جو تمہاری طرح خدا کے بھیجے ہوئے رسول کا انکار کر رہے تھے، اور اب تم انہی کے نقشِ قدم پر چل کر اس انجامِ بد کی طرف برابر بڑھ رہے ہو "تمہارے آگے آرہا ہے"، یعنی یہی قہر و غضب اور عتاب و عذاب تمہارے آگے آرہا ہے، خدا کے نمائندے کے ساتھ جو برتاؤ تم کر رہے ہو اس کا انجام لازماً یہی ہے۔

٦٠ "تاکہ تم پر رحم کیا جائے"، یعنی خدا کے رحم و کرم کا مستحق بنانے والا کردار یہی ہے کہ آدمی ماضی کی تاریخ سے سبق لے اور اپنی روش کو بدلے، اور مستقبل کو بنانے کی فکر سے ہرگز غافل نہ ہو وہ لوگ آخر کس طرح خدا کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں جو نگاہیں بند رکھتے ہیں نہ انھیں اپنے پیچھے کی تاریخ نظر آتی ہے اور نہ انھیں آگے آنے والے انجام کی فکر ہوتی ہے۔

٦١ قوسین کی یہ عبارت یا اس مفہوم سے ملتی جلتی عبارت یہاں سے محذوف ہے، اور آگے آنے والی آیت "اور ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو..." سے یہ محذوف عبارت خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے، اور اس کو لانے کی ضرورت کبھی نہیں محسوس ہوتی۔

٦٢ دراصل ان دو آیتوں میں منکرینِ رسالت کی ایک عبرتناک بیماری انھیں محسوس کرائی گئی ہے۔ کہ اگر کوئی سعید روح ان میں موجود ہو تو اس کی نگاہ عبرت کھُل جائے۔ اور اس پر حق و صداقت کا راستہ واضح ہوجائے۔ ہوتا یہ ہے کہ مسلسل انکار، نافرمانی اور ڈھٹائی کی پاداش میں ایسے لوگوں کی نگاہِ عبرت بے نور ہوجاتی ہے۔ ان کا دل سوچنے سمجھنے اور اثر لینے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ اور ان کے احساس و شعور کی قوتیں

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٤٧﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرو[۶۳] تو یہ کفر کرنے والے ایمان والوں سے کہتے ہیں۔ کیا ہم انھیں کھلائیں جنھیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا[۶۴] تم لوگ تو بالکل ہی بھٹک گئے ہو۔[۶۵]

مفلوج ہو کر ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ نہ یہ ان اقوام سے عبرت حاصل کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں اور نہ سنجیدگی سے اپنے انجام پر غور کرنے کی ان میں سکت ہوتی ہے۔ اگر کچھ لوگ ان کے ساتھ خیر خواہی کر کے ان کو ان کی بھلائی سمجھاتے ہیں تو یہ ان کی شکر گزاری کے بجائے خود انھیں کے درپے آزار ہو جاتے ہیں، اور یہ عقل کے دشمن اپنے دردمندوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں، زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی روشن نشانیاں ان کے سامنے آتی ہیں تو یہ نادان ذرا ان پر غور نہیں کرتے، کتاب اللہ کی واضح آیات اور تعلیمات ان کو سنائی جاتی ہیں، کہ ان کے ذہن و قلب کی گرہیں کھلیں، مگر یہ ناعاقبت اندیش بے رُخی سے منہ موڑے ہی رہتے ہیں، اور قطعاً دھیان نہیں دیتے، ڈھٹائی، غفلت، بے پروائی، گستاخی اور انکار ان کی مستقل عادت بن چکی ہے۔ ان کے لئے نہ ماضی کی تاریخ میں کوئی سامان عبرت ہے۔ نہ مستقبل کے بارے میں یہ کبھی سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ اپنی روش پر غور کر سکیں، اللہ اپنی رحمت و کرم سے ان کو چونکانے اور ہشیار کرنے کے مختلف حالات اور تدبیریں فراہم کرتا ہے۔ اور تنبیہ کرتا ہے کہ یہ رُک کر سوچیں، مگر تذکیر، تفہیم، تنبیہ، کوئی چیز بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی، ہٹ دھرمی، لاپروائی، بے رُخی اور انکار ان کی فطرت بن چکی ہے۔ اور خدا کی طرف سے رسول آئے یا اس کی واضح تعلیمات، ان کا محبوب مشغلہ یہی ہے کہ یہ اس کا مذاق اڑائیں اور گستاخی کے ساتھ انکار کریں۔ اسی سورت کی آیت ۳۰ میں ان لوگوں کی اس عبرتناک حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

يَحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝	افسوس بندوں کے حال پر! ان کے پاس جو رسول بھی آیا، یہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔

قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی اس کردار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم	ان کے پاس ان کے رب کے پاس سے جو تازہ یاددہانی

مُحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ○ بھی آتی ہے اس کو بتکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ اس کردار کے تعارف میں مومن کے لئے یہ سبق ہے کہ وہ اپنا جائزہ لیتا رہے کہ اس کے صاف کردار پر اس بیماری کے دھبے نہ پڑنے پائیں۔

۶۳؎ "اَنْفِقُوْا" کے لغوی معنی تو ہیں خرچ کرنا، مگر قرآن میں دراصل انفاق کے معنی ہیں "انفاق فِی سبیل اللہ" یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنا۔ قرآن میں کہیں تو "فی سبیل اللہ" کا لفظ انفاق کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور کہیں محذوف ہوتا ہے۔ لیکن جہاں صرف "انفاق" ہوتا ہے وہاں بھی "انفاق فی سبیل اللہ" ہی مُراد ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی فی سبیل اللہ کا لفظ نہیں آیا ہے مگر مفہوم یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور آیت کا اگلا فقرہ اس کی واضح دلیل ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے، کہ اللہ کی ہدایت کے مطابق اس کی بتائی ہوئی مدوں پر خرچ کرو۔ اور خاص طور پر، محتاجوں ناداروں، معذوروں اور دینی ضرورت کے کاموں میں خرچ کرو۔

۶۴؎ منکرینِ حق کا یہ جواب نقل کر کے دراصل قرآن یہ بتانا چاہتا ہے، کہ خدا اور اس کی ہدایت کے ساتھ تکبر اور مذاق کرنے والے صرف عقل و بصیرت ہی سے محروم نہیں ہوتے بلکہ ان کی اخلاقی حِس بھی بالکل مُردہ ہو جاتی ہے، وہ ہمدردی، غمگساری، رحم اور سخاوت جیسی اخلاقی خوبیوں سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں، ان کے خاندان اور ان کے معاشرے میں ان کے بھائی بند ننگے ہوں یا بھوکے وہ بیمار و معذور ہوں یا کسی اور پریشانی کا شکار ان کے دل میں رحم اور شفقت کا کوئی جذبہ نہیں اُبھرتا، ان کے سوچنے کا انداز یہ ہوتا ہے جو ان کے اس جواب سے ظاہر ہے، کہ یہ محتاج اور معذور اسی لائق ہیں۔ اگر یہ کسی لائق ہوتے تو اللہ نے خود ان کو دیا ہوتا، اللہ نے ان کو ننگا بھوکا، اور خستہ حال اسی لئے رکھا ہے کہ وہ اسی کے لائق ہیں، اس انداز فکر سے ان کی انتہا درجے کی تنگ دلی بُخل، زر پرستی اور خود غرضی کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور ان کے کبر و غرور اور معذوروں اور محتاجوں کے ساتھ تمسخر اور تحقیر و تذلیل کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ وہ ان کو ناکارہ سمجھ کر اسی ذلت اور خستہ حالی کا مستحق سمجھتے ہیں، اور اپنے بارے میں ان کا تصور یہ ہے کہ انھیں جو خوش حالی اور سامانِ عیش حاصل ہے وہ ان کی اپنی کوششوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو۔ دراصل یہ ایک زوردار دھماکے کی راہ تک رہے ہیں ۶۶

۶۵ یہ فقرہ دراصل خدا کی طرف سے ان منکرینِ حق کو تنبیہ ہے کہ تم صرف عقل و بصیرت کے اندھے ہی نہیں ہو، تم اخلاقی جوہر سے بھی محروم ہو، تمہیں ہر ہدایت اور نصیحت الٹی معلوم ہوتی ہے اور تم اس کا غلط مفہوم لینے ہی کی کوشش کرتے ہو، بھلا سوسائٹی اور خاندان کے گرے پڑے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنا، انھیں اونچا اُٹھانے کی کوشش کرنا بھی کوئی ایسی بات ہے، جس کے لئے انسان کا ضمیر، اس کا دل اور اس کی عقل اُسے نہ اُکسائے۔ مگر جو شخص خدا اور اس کی ہدایت سے منہ موڑ کر اس کے ساتھ ذلت اور تمسخر کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ بھلا خدا کے بندوں کے ساتھ نیک سلوک کیسے کر سکتا ہے، کیا ایسے شخص کی گمراہی کو واضح کرنے کے لئے بھی کسی دلیل کی ضرورت ہے؟

۶۶ اوپر کی آیات میں توحید کے نہایت ہی مؤثر اور بصیرت افروز دلائل زمین و آسمان اور آدمی کے اردگرد پھیلی ہوئی نشانیوں سے پیش کئے جا رہے تھے۔ ضمناً ان دلائل سے عقیدۂ آخرت کی ضرورت، واقعیت اور امکان پر بھی روشنی پڑ رہی تھی، اب براہ راست عقیدۂ آخرت پر گفتگو ہو رہی ہے منکرینِ حق کے حلق سے یہ بات کسی طرح نہیں اُتر رہی تھی کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اس لئے پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں وہ اپنے انکار اور ہٹ دھرمی کا اظہار اس طرح کرتے تھے۔ "آخر یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو" قرآن پاک میں یہ آیت بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ چھ مقامات پر آئی ہے۔ سورہ یونس آیت ۴۸، سورہ الانبیار آیت ۳۸، سورۂ النمل آیت ۷۱، سورۂ النسا آیت ۲۹، سورہ یٰس ۴۸، سورہ الملک آیت ۲۵، اور کتنے ہی مقامات پر یہی بات الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ بھی کہی گئی ہے۔

منکرینِ حق دراصل یہ کہتے تھے، کہ ہمیشہ سے لوگ یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ قیامت آئے گی، تو آخر وہ کونسا دن اور مہینہ ہوگا جب قیامت قائم ہوگی۔ یہ غیر سنجیدہ سوال دراصل وہ اس لئے زبان پر لاتے تھے کہ حق دشمنی کے نتیجہ میں ان کے دل مُردہ ہو چکے تھے، ان کے دلوں سے خوفِ خدا نکل چکا تھا، اور وہ خُدا اور رسول کے معاملے میں بڑے ڈھیٹ اور گستاخ ہوگئے تھے اس لئے قرآن نے ہر مقام پر نہایت حکمت کے

تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾

جو انھیں آپکڑے گا،[۷۷] عین اس حالت میں جبکہ یہ جھگڑ رہے ہوں گے[۷۸] پھر یہ نہ کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں میں لوٹ کر ہی جاسکیں گے[۷۹]

ساتھ ان کے ذہن کو اچھے رُخ پر موڑنے کا انداز اختیار کیا ہے، کہ اگر خیر کی کوئی رمق بھی ان کے اندر موجود ہو تو ان کے دلوں میں نرمی، گداز اور رجوع پیدا ہو سکے۔

قرآن نے کہا نادانو! تم پوچھتے ہو یہ دھمکی کب پوری ہوگی؟ — سوچنے کی بات یہ نہیں ہے کہ یہ دھمکی کب پوری ہوگی اور قیامت کس تاریخ کو آئے گی۔ سوچنے کی بات دراصل یہ ہے کہ اس دن کی ہونا کی سے بچنے کے لئے تم کیا کر رہے ہو؟ پھر قرآن انھیں تصور کے عالم میں میدانِ آخرت میں پہنچا کر وہاں کے لرزہ خیز مناظر دکھاتا ہے کہ ان کے دلوں سے غفلت دور ہو اور رقّت پیدا ہو سورۃ القیامہ میں ہے۔

"پوچھتا ہے آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟ پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ اور چاند سورج ملا کر ایک کر دئے جائیں گے۔ اس وقت یہی انسان کہے گا۔ کہاں بھاگ کر جاؤں؟ ہرگز نہیں وہاں کوئی پناہ گاہ نہ ہوگی اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔ بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔" (آیت ۶ - ۱۵)

یہی حکیمانہ انداز یہاں بھی ہے۔ منکرین کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پہلے قیامت کے رقت انگیز مناظر سامنے لائے گئے ہیں اور پھر آخر میں قیامت کے دلنشیں دلائل دئے گئے ہیں۔

[۷۷] اس زوردار دھماکے سے مُراد پہلا نفخِ صور ہے۔ قرآن و سنّت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تین مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ (ابن کثیر ج ۳ ص ۳۷۷)

پہلا صور نفختہ الفزع :- جب یہ پھونکا جائے گا تو ہر طرف عام گھبراہٹ، دہشت اور سراسیگی پھیل جائے گی، اور زمین و آسمان کی ساری مخلوقات خوف و دہشت سے سہم جائیں گی۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ	اور کیا گزرے گی اس روز جب صور پھونکا
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ	جائے گا اور دہشت زدہ ہو جائیں گے وہ جو

آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ (النمل ۸۷)

دوسرا صور نفختہ الصعق :۔ جب یہ دوسرا صور پھونکا جائے گا تو اس کی ہولناک آواز سنتے ہی جو جہاں ہو گا گر کر ڈھیر ہو جائے گا۔ اور ہر طرف موت اور ویرانی کا سناٹا چھایا ہو گا۔ (الزمر آیت ۶۸)

تیسرا صور نفختہ لقیام رب العالمین :۔ یہ تیسرا صور جب پھونکا جائے گا تو سارے انسان رب العالمین کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔

ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ (الزمر آیت ۶۸)

پھر ایک اور صور پھونکا جائے گا تو یکایک سب اُٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔

اور اس سورت کی آیت ۵۱ میں بھی اسی صور کی طرف اشارہ ہے "پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکایک یہ سب اپنے رب کے حضور حاضر ہونے کے لئے اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے" اور آیت ۵۳ میں بھی اسی صور کا بیان ہے۔ "ایک ہی زور کا کڑاکا ہو گا اور سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دئے جائیں گے"۔

۵۶ یعنی لوگ بڑے اطمینان سے دنیوی معاملات میں ہر فکر سے غافل لڑ جھگڑ رہے ہوں گے یہ دراصل بڑی ہی عبرت انگیز تصویر کشی ہے اس حقیقت کی کہ دنیا کے پرستار دنیا کے دھندوں میں لگے ہوئے ہوں گے، راستوں اور بازاروں میں چہل پہل ہو گی، لوگ مجلسوں اور نشست گاہوں میں بات چیت اور گپ بازیوں میں مصروف ہوں گے، بازاروں میں خرید فروخت ہو رہی ہو گی، کہ یکایک صور کی دہشتناک آواز بلند ہو گی اور جو جہاں ہو گا سہم کر دم بخود ہو جائے گا۔ احادیث میں حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عبد اللہ ابن عمروؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :۔

• کہ لوگ راستوں میں چل رہے ہوں گے، بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہوں گے، اپنی محفلوں میں بیٹھے بات چیت کر رہے ہوں گے، ایسے میں یکایک صور کی دل ہلا دینے والی آواز بلند ہو گی۔ کوئی کپڑا خرید رہا ہو گا تو کپڑا پھیلا کا پھیلا رہ جائے گا اُسے لپیٹنے کی مہلت نہ ملے گی کہ وہ ختم ہو جائے گا۔ کوئی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لئے حوض ٹھیک کرنے اور بھرنے میں لگا ہوا ہو گا۔ اور ابھی پانی پلانے کی نوبت بھی نہ آئے گی کہ قیامت برپا ہو جائے گی، کوئی جانور کا دودھ دوہ کر ایک گھونٹ حلق سے اتارنے بھی نہ پائے گا، کہ ڈھیر ہو جائے گا، کوئی کھانے کا ارادہ کرے گا اور منہ تک نوالہ لے جانے نہ پائے گا کہ

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا
مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ إِنْ كَانَتْ
إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور پھر صور پھونکا جائے گا۔[۷۰] تو یکایک سب اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لئے اپنی قبروں سے نکل کر دوڑ پڑیں گے۔ کہیں گے "ہائے ہماری شامت، یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے اٹھا کھڑا کیا؟" یہ وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا، اور رسولوں نے سچ کہا تھا، بس ایک زور کا دھماکہ ہوگا پھر یکایک یہ سب ہمارے حضور حاضر کر دئے جائیں گے۔

قیامت آپڑے گی۔"

[۶۹] کہنا یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو پھر کچھ سوچنے اور سنبھلنے کی مہلت نہ ملے گی، مہلت ختم ہو چکی ہوگی۔ وہ جب آئے گی تو تمہاری آنکھیں تو کھل جائیں گی، مگر اس وقت آنکھیں کھلنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس وقت نہ تمہیں یہ مہلت ملے گی کہ تم اپنے دل کی بات کسی سے کہہ سکو اور نہ اس کی مہلت ہوگی کہ تم گھر والوں کے پاس لوٹ کر جا سکو جہاں تم ہوگے وہیں دھر لئے جاؤ گے، تمہاری مہلتِ عمل ختم ہو چکی ہوگی۔ آج تمہیں سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت حاصل ہے۔ یہ مہلت صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ ایک بار ختم ہونے کے بعد دوبارہ کبھی نہیں ملتی، کتنی بڑی نادانی ہے کہ تم قرآن کی تنبیہ اور تذکیر سے ہوش میں آنے کے بجائے اس یقینی حقیقت کا انکار کر رہے ہو، بلکہ مذاق اڑا رہے ہو، تمہارے انکار اور مذاق سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی البتہ تمہاری ہی عاقبت مزید خراب ہو سکتی ہے۔

[۷۰] اس سے مراد تیسرا صور ہے یہ تیسرا صور جب پھونکا جائے گا تو سارے انسان اپنی اپنی جگہ یکایک جی اُٹھیں گے اور حیرت و دہشت کے ساتھ سر اُٹھائے اپنے رب کے سامنے پیش ہونے کے لئے دوڑ پڑیں گے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ تیسرے صور کے بعد کی حیرانی، پریشانی، دہشت اور پچھتاوے کی کیفیات کو بڑے رقت انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ — وہ تو انھیں ٹال رہا ہے اس دن کے لئے جب

اَلْاَبْصَارُ ٥ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ٥

(ابراہیم ۴۲، ۴۳)

یہ حال ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں، سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی نظریں اوپر کی جانب جمی ہوئی ہیں اور ان کے دل اُڑے جاتے ہیں۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ٥ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ

(القمر ۷، ۸)

لوگ (شرم وخوف سے) جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اپنی قبروں سے اس طرح نکلیں گے گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں، پکارنے والے کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے۔

اے "يَنْسِلُوْنَ" اس کا مصدر نسلان ہے، اور اس کے معنی ہیں، تیز چلنا اور دوڑنا۔ مفہوم یہ ہے کہ جونہی تیسرے صور کی ہیبتناک آواز ان کے کانوں میں پہنچے گی وہ یکایک اُٹھ کھڑے ہوں گے، اور حیرت وپشیمانی، اور دہشت وخوف سے نظریں جھکائے اپنے رب کے حضور حاضری کے لئے بھاگے چلے جا رہے ہوں گے۔ ایک دوسری آیت میں دوڑنے کی صراحت کی گئی ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ٥

(المعارج ۴۳)

جس دن وہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے (دوڑ کا مقابلہ کرنے والے) مقررہ نشان کی طرف دوڑتے ہیں۔

۲ے اس آیت میں تین حقیقتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

پہلا اشارہ تو یہ ہے کہ موت کے بعد سے فیصلۂ حشر تک کی زندگی ایک طرح کی نیند اور غشی کی زندگی ہوگی اگرچہ اس میں آدمی کو دُکھ اور سکھ کا احساس بھی ہوگا۔ مسرت اور غم کے جذبات بھی ہونگے مگر یہ ایک عبوری زندگی ہوگی جس میں آدمی اپنے اصل انجام کے مطابق حالات اور سلوک سے دوچار ہوگا۔ آخرت کی اصل زندگی اس وقت شروع ہوگی جب تیسرا صور پھونکے جانے کے بعد آدمی فیصلے کے لئے اپنے رب کے حضور پیش ہوگا۔ اور اس فیصلے کے بعد ہی اصل انجام اپنی پوری کیفیات کے ساتھ سامنے آئے گا۔

دوسرا اشارہ ایک زبردست تنبیہ اور ڈراوا ہے کہ آخرت کا عذاب شدید ترین عذاب ہے۔ اس کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے اٹھا کھڑا کیا؟" یعنی مجرمین قبروں کو خواب گاہوں سے تعبیر کریں گے۔ اس تعبیر بیان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قبروں میں عذاب نہ ہوگا ——— اور وہاں مجرم لوگ آرام سے پڑے سوتے ہوں گے۔ اس لئے کہ عذاب قبر تو قرآن و سنت کی واضح تصریحات سے ثابت ہے جس میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ دراصل اس تعبیر بیان کی بلاغت اور تاثیر کا کمال یہ ہے کہ اس کے ذریعے قرآن عذابِ آخرت کی بےپناہ شدت محسوس کرانا چاہتا ہے، قلب و دماغ واقعی اسے محسوس کرنے لگتے ہیں۔

قبر اور عالمِ برزخ کے عذاب سے متعلق جو وحشتناک تفصیلات احادیث میں بیان ہوئی ہیں انھیں سُن کر پتہ پانی ہونے لگتا ہے، اور دہشت سے دل دہلنے لگتا ہے، مگر قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جب تیسرا صور پھونکا جائے گا۔ اور مجرمین خدا کے حضور پیشی کے لئے دوڑیں گے تو اس وقت کی دہشت اور جہنم کا عذاب اس قدر سخت اور دردناک ہوگا کہ مجرمین کو قبر کا یہ عذاب ہیچ معلوم ہوگا۔ انھیں قبر کے بیتے ہوئے ایام سکون و راحت کے لمحات محسوس ہوں گے اور وہ گھبرا کر کہیں گے کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے اُٹھا کھڑا کیا۔

تیسرا اشارہ یہ ہے کہ جب آخرت کا دائمی عذاب سامنے آئے گا۔ اور اس کی شدت و غضب کو یہ دیکھیں گے تو انھیں پچھلا گزرا ہوا پورا دور ایسا محسوس ہوگا جیسے ایک جھپکی لگی اور یکایک آنکھ کھل گئی۔ اس اشارے کی وضاحت دوسرے مقام پر قرآن میں یوں کی گئی ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ط كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ	اور جس دن قیامت کی گھڑی برپا ہوگی تو یہ مجرم لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھیرے ہیں، اسی طرح دنیا کی زندگی میں وہ دھوکا کھاتے رہے تھے، مگر جنھیں علم اور ایمان سے نوازا گیا تھا، وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے ہو، سو یہ وہی روزِ حشر ہے

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

پس آج کسی شخص پر ذرہ برابر زیادتی نہ کی جائے گی اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے عمل تم کرتے رہے تھے۔[۷۵]

لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ الروم آیت ۵۵،۵۶) لیکن تم جانتے نہ تھے۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۵۲)

جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے۔ اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی ہی دیر اس حالت میں پڑے رہے ہیں۔

۷۳ے یعنی رسولوں کی یہ خبر بالکل سچی تھی کہ تمہیں ایک دن دوبارہ اٹھنا ہے اور زندگی کا حساب دینا ہے' جو کچھ کل ہونے والا ہے قرآن نے اس کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ گویا آدمی خود میدانِ حشر میں کھڑا آج وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اپنے کانوں سے سُن رہا ہے۔ دلوں میں رقت پیدا کرنے اور آنکھیں کھولنے کے لئے یہ بڑا ہی مؤثر اور نفسیاتی اندازِ بیان ہے۔ مگر اُسی کے لئے جس کے دل میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو۔ ایک اور مقام پر قرآن میں ہے۔

وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت آیت ۲۰-۲۱)

اور اس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی! یہ تو فیصلہ کا دن ہے یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

۷۴ے حاضر کر دئے جائیں گے۔ خود حاضر نہ ہوں گے بلکہ پکڑے ہوئے لائے جائیں گے اسی لئے بعض لوگوں نے ترجمہ کیا ہے گرفتار کر کے لائے جائیں گے۔ قرآن میں ہے۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝ (قٓ آیت ۱۹)

ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔

۷۵ے اندازِ بیان عام ہے نیک و بد ہر ایک سے یہ بات کہی جاسکتی ہے لیکن قرآن میں اس طرح کی بات مجرموں اور گنہگاروں ہی سے کہی گئی ہے اور دوسرا فقرہ "تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے عمل تم کرتے

إِنَّ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلٰلٍ عَلَى
الْأَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ
قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾

بے شک آج[۷۶] جنت والے مزے کرنے میں مشغول ہیں، وہ اور ان کے جوڑے گھنے سایوں میں مسندوں پر تکیہ لگائے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے لذیذ میوے اور ہر وہ چیز موجود ہے جو وہ طلب کریں، سلام کا بول ہے ان کے لئے ان کے بہت ہی مہربان پروردگار کی جانب سے۔

رہے تھے۔" دراصل پہلے فقرے کی تکمیل اور توضیح ہے۔ زیادتی نہ کی جائے گی کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے کرتوتوں سے زیادہ سزا تمہیں نہ دی جائے گی۔ یہ دراصل وہ خطاب ہے جو خداوندِ عالم حشر کے میدان میں کفار و مشرکین اور فاسق و مجرم لوگوں سے فرمائے گا جب وہ اس کے حضور حاضر کئے جائیں گے۔

[۷۶] میدانِ حشر کی لرزہ خیز کیفیات اور مجرموں کا حالِ زار بیان کرتے کرتے یکایک یہ منظر کشی کہ آج خدا کے صالح بندے جنت میں ہیں اور وہاں کی گوناگوں نعمتوں کے مزے لے رہے ہیں، دراصل ایک خوش کن حقیقت ذہن نشین کرانے کے لئے ہے۔ کہنا یہ ہے کہ خدا کے باغی اور سرکش مجرم اپنا حساب دینے میں الجھے ہوئے میدانِ حشر کی سختیاں جھیل رہے ہیں اور خدا کے نیک بندے ہلکے پھلکے حساب کے بعد فوراً جنت میں پہنچ گئے۔ ان کا ریکارڈ صاف تھا اس لئے یہ میدانِ حشر کی سختیوں سے محفوظ رہے، اور خدا نے ان کے نامۂ اعمال پر ایک نظر ڈال کر انھیں رخصت کر دیا اور وہ جنت میں بیٹھے مزے لینے میں مشغول ہیں جبکہ مجرمین حشر کے میدان میں حیران و پریشان ہیں۔ یہ وجد انگیز منظر سامنے لاکر ترغیب دی گئی ہے کہ ایک دانا و بینا شخص کی کوشش و کاوش کا مرکز یہی ہونا چاہیئے کہ وہ اُس دن حساب کی سختی اور باز پُرس سے بچ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض نمازوں میں آسان محاسبے کی یہ دُعا بھی مانگتے تھے۔

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بعض نمازوں میں یہ دُعا کرتے سُنا کہ "اے اللہ مجھ سے آسان محاسبہ فرما! میں نے پوچھا اے اللہ کے نبیؐ! آسان محاسبہ سے کیا مطلب

ہے؟ ارشاد فرمایا، آسان محاسبہ یہ ہے کہ بندے کے اعمال نامے پر ایک نظر ڈال کر اس سے درگزر کی جائے حقیقت یہ ہے کہ اس دن جس سے حساب میں جرح کی گئی تو اے عائشہ! (اس کی خیر نہیں) وہ تو ہلاک ہوگیا۔ (مسند احمد)

۷۷ـہ جنتی لوگ جن بے مثال نعمتوں کے مزے لے رہے ہوں گے، ان کی صحیح حقیقت وکیفیت نہ ہم سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے۔ اس سلسلہ میں یقین کی ٹھنڈک اور روحانی سرور حاصل کرنے کے لئے خدا کا یہ وعدہ اور رسول اللہ کے الفاظ بہت کافی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گزرا، پھر فرمایا چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ (بخاری ومسلم)

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ	کوئی شخص نہیں جان سکتا جو کچھ ان صالح
مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (الم سجدہ)	بندوں کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کیا گیا ہے

۷۸ـہ اصل میں لفظ ازواج استعمال کیا گیا ہے جو زوج کی جمع ہے اور زوج کے معنی ہیں جوڑا، میاں بیوی کے لئے جوڑا ہے اور بیوی میاں کے لئے جوڑا ہے۔ یعنی جنتی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ جنت کے گھنے سایوں میں مزے لے رہی ہوگی اور جنتی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ۔ ایسا نہیں ہے کہ جنت کے اصل مستحق تو مرد ہیں اور ان کی دلجوئی کے لئے انھیں بیوی کی نعمت بھی مہیا کی جائے گی۔ اس حقیقت کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے کے لئے ہم نے ازواج کا ترجمہ بیویاں کرنے کے بجائے جوڑا کیا ہے۔

۷۹ـہ سلام کا لفظ نہایت جامع اور ہمہ گیر ہے اور اس میں ہر قسم کی سلامتی مراد ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے سلام کے معنی در اصل یہ ہیں کہ گویا خدا اُن کو سلامتی کی خوش خبری اور وعدہ دے رہا ہے اور اب جنت میں آنے کے بعد کوئی رنج کوئی تکلیف کوئی نقصان، کوئی پریشانی کوئی خطرہ کوئی بیماری ہرگز نہ ہوگی۔ بس سلامتی ہی سلامتی ہوگی، براہِ راست خدا کی طرف سے بھی ان کے لئے سلام ہی کا بول ہے اور فرشتوں کے واسطے سے بھی۔ بس جنت میں ہر سو سلام ہی سلام کی صدا ہوگی۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا	وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں
اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ○	گے بس سلام ہی سلام کا بول سنیں گے۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا
الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

اور آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ اے مجرمو! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی
اے آدم کے بچو! کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے
اور یہ کہ میری ہی بندگی کرنا یہ سیدھا راستہ ہے۔

میدان حشر کی اس ڈانٹ پھٹکار کا مفہوم یہ ہے کہ اے مجرمو! اب اس کا کوئی موقع نہیں رہا کہ تم اپنے جرموں اور گناہوں پر پردہ ڈالے رہو، اور ہر طرح کے جرموں اور نافرمانیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود نیک لوگوں، صالح جماعتوں اور اپنے قبیلے اور اچھی برادری کے لوگوں میں اپنے کو شامل کئے رہو، آج بے لاگ فیصلے کا دن ہے آج کا دن مومنوں اور مجرموں کو چھانٹ کر الگ کر دینے والا دن ہے دُنیوی زندگی کی وہ مہلت ختم ہو گئی جب تم ہر طرح کی سرکشی اور زیادتی کرنے کے باوجود خود کو اور دنیا والوں کو اس دھوکے میں مبتلا رکھ سکتے تھے کہ تم بھی نیک انجام کی راہ پر چل رہے ہو، آج مجرموں کا الگ جتھا بن کر اور کھلے مجرم بن کر سامنے آجاؤ اور اپنے بھیانک انجام کا انتظار کرو۔ قرآن نے جگہ جگہ مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قیامت کے دن سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔ مجرم اور بدکار صالح مومنوں سے چھٹ کر الگ ہو جائیں گے اور سارے انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰۗىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝

(الروم ۱۴-۱۶)

اور جس روز گھڑی برپا ہو گی اس دن سب الگ الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے پس جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کئے ہیں وہ ایک باغ میں خوش و خرم ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ہے وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے۔

پھر میدانِ حشر کی اس ڈانٹ پھٹکار کو قرآن نے ایک خبر کے انداز میں ذکر نہیں کیا، واقعے کے طور پر وہ

قاری کو میدان حشر میں پہنچا دیتا ہے اور قاری سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اپنے کانوں سے سنتا محسوس کرتا ہے اور ظاہر ہے قرآن کا یہ اندازِ بیان کلام کو انقلاب انگیز اور پُراثر بنانے میں بے مثال ہے۔

اس موقع پر یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ قرآن کی کسی بھی آیت کو کسی خاص گروہ پر چسپاں کر کے خود کو غیر متعلق سمجھ کر اطمینان کا سانس لے لینا، ہرگز صحیح طرزِ فکر نہیں ہے۔ ہر آیت کا خطاب ہر قاری سے ہے یہ اندازِ فکر دراصل اپنے ہاتھوں اپنے کو قرآن کے فیض سے محروم کر لینا ہے، اور خدا کے فراہم کئے ہوئے تربیت و اصلاح کے موقع کو نادانی اور غفلت سے کھو دینا ہے ان آیات کو پڑھتے ہوئے یہ سمجھ لینا کہ یہ تو کافروں اور مشرکوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم اس پر کیوں سوچیں، صحیح نہیں۔ اس طرح کی آیتیں دراصل ہر قاری کی دینی شخصیت اور ایمانی کیفیت کے لئے ایک کسوٹی ہیں، مومن ان آیات کو پڑھتا ہے تو اس کا دل لرزنے لگتا ہے۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کہ معلوم نہیں میرا شمار کن لوگوں میں ہوگا۔ اور غافل انسان ان آیات کو پڑھتا ہے تو سر جھٹک کر اور اطمینان کے ساتھ دوسروں پر انھیں چسپاں کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ حضرت امام اعظمؒ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار وہ تمام شب یہ آیت پڑھتے رہے اور روتے رہے اور قرآن سے ایسے ہی مومن فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۱ؔ۸ اس ہدایت اور عہد سے مراد وہ عہد و میثاق ہے جو ازل میں خدا نے آدم کی پوری ذرّیت سے لیا تھا۔ کہ میں ہی تمہارا رب ہوں، میری ہی بندگی کرنا اور میرے سوا کسی کی بندگی نہ کرنا۔ پھر ہر دور میں نبی اور رسول اسی عہد کی تجدید کرتے رہے۔ اور خدا کے بندوں کو اس عہد کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تیار کرتے رہے۔ دوسری طرف شیطان بھی برابر اپنی مہم میں لگا رہا۔ بندگانِ خدا کے ذہنوں سے اس ازلی عہد کو کھرچ پھینکنے اور اُس کے تقاضوں کو بھلا دینے کی کوشش میں پورے جوش اور انہماک کے ساتھ مشغول رہا۔ اور اپنی بندگی اور اطاعت کی راہ ہموار کرتا رہا۔

۲ؔ۸ شیطان کی بندگی اور عبادت سے مُراد شیطان کی اطاعت ہے۔ شیطان اس سے تو قطعی مایوس ہو چکا ہے کہ کرۂ ارض پر کوئی اس کی پوجا اور پرستش کرے، اور اس کے آگے سجدہ ریز ہو البتہ وہ اس سے مایوس نہیں ہے کہ یہ نادان انسان اس عدوِ مبین کی اطاعت کرے اور اس کے نقشِ قدم پر چلے۔ خدا کا حکم اور وصیت یہ ہے کہ اس کے بندے صرف اسی کی بندگی کریں یعنی صرف اسی کی عبادت کریں اور پوری زندگی میں صرف اسی کی اطاعت و فرمانبرداری کریں، کسی معاملہ میں بھی شیطان کی اطاعت و فرمانبرداری نہ کریں۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور وہ تم میں سے ایک خلقِ کثیر[۵۳] کو بھٹکا کر رہا۔ تو کیا تم لوگ عقل نہ رکھتے تھے؟[۵۴] یہ وہی جہنم ہے[۵۵] جس سے تم کو برابر ڈرایا جا رہا تھا،[۵۶] جاؤ جھلسو اس کے اندر اس کفر کی سزا میں جو تم برابر کرتے رہے تھے۔[۵۷]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ

اے ایمان والو! سب مل کر پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرو

اسلام کے دائرہ اطاعت کو اگر ہم ایک عمارت تصور کر لیں تو وہی شخص اسلام میں داخل سمجھا جائے گا جو اپنے پورے وجود کے ساتھ اسلام میں داخل ہو جائے اگر اس کا ایک قدم اندر ہے اور ایک باہر تو وہ داخل نہ سمجھا جائے گا یعنی اسلام میں داخلہ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ آدمی پورا کا پورا داخل ہو۔ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان، سرکشی، بغاوت، نافرمانی اور نفس پرستی کا رویہ اختیار نہ کرے، یہ رویہ اختیار کرنا شیطان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا ہے پھر یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ آدمی جس جس معاملہ بھی خدا کی نافرمانی کرتا ہے دراصل اس معاملے میں وہ لازماً شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں خدا کی کامل فرمانبرداری اور اطاعت نہ کرنے کا مطلب قطعی طور پر شیطان کی اطاعت اور تابعداری ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں، شیطان کی عبادت نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت نہ کرو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شیطان کو صرف سجدہ کرنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کی تابعداری کرنا بھی ممنوع ہے۔ پھر امام صاحب نے ایک سوال یہ اُٹھایا ہے کہ عبادت اگر اطاعت کے معنی میں ہے تو کیا آیت اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ میں ہمیں رسول اور امراء کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ ان کی اطاعت جب اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت اور اسی کی اطاعت ہو گی۔ کیا دیکھتے نہیں کہ ملائکہ نے اللہ کے حکم سے آدم کو سجدہ کیا اور یہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ تھی۔"

[۵۳] جبل کے معنی ہیں، مخلوق، جبلِ کثیر یعنی خلقِ کثیر مشہور مفسر حضرت مجاہد اور قتادہؒ نے یہی معنے نقل

کئے ہیں۔

ﮨﺸﮧ تو کیا تم عقل نہ رکھتے تھے، یہ سوال نہیں ہے، بلکہ شیطان کے گمراہ کردہ اولادِ آدم کو ملامت اور تنبیہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ اب تمہارے لئے نہ عذر کا کوئی موقع ہے اور نہ کسی اور کو تم الزام دے سکتے ہو، یہ جو کچھ تمہارے سامنے آرہا ہے وہ تمہارے اپنی ہی کرتوتوں کا انجام ہے۔ اس کی تفصیل سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سابق کی آیت کا مفہوم بھی ذہن میں تازہ رہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ اے آدم کے بچو! ہم نے ازل میں تم سے اپنی بندگی کا عہد لیا اور ہر دور میں اس عہد کی تجدید کے لئے پیغمبر بھیجے، آسمانی کتابیں بھیجیں اور بار بار یاددہانی کراتے رہے کہ صرف اپنے رب کی بندگی کرتے رہنا، یہی سیدھا سچا راستہ ہے جو تمہیں خدا کی رضا اور جنت تک پہنچائے گا اور یہ کہ شیطان کے راستے پر ہرگز نہ چلنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ پھر ہم نے تمہیں عقل وخرد سے نوازا، دوست دشمن کی تمیز عطا کی، اچھے بُرے کو جاننے کی صلاحیت بخشی لیکن اس غیر معمولی انتظام اور اہتمام کے باوجود تمہارا ازلی دشمن تمہیں بہکاتا رہا اور تم بھٹکتے رہے۔ آخر تمہاری وہ عقل جو دنیوی معاملات میں اپنے حیرت انگیز کمالات کے جوہر دکھاتی رہی۔ اس معاملہ میں کیوں ناکارہ ثابت ہوئی — دین کے معاملے میں ہی تم اس قدر غبی کیوں ہوگئے، اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئی کہ جس نے پیدا کیا اور جس نے زندگی گزارنے کا سارا سامان دیا، وہی تمہارا رب ہوسکتا ہے، کوئی دوسرا بندگی کے لائق ہرگز نہیں ہوسکتا، تعجب ہے کہ تم سب کچھ سمجھتے رہے مگر کفر وایمان اور شرک وتوحید کی حقیقت کو سمجھنے میں تمہاری عقل کام نہ آئی، اور تمہارا ازلی دشمن تم میں سے ایک خلقِ کثیر کو بھٹکا لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

یہ ملامت، تنبیہ اور ڈانٹ پھٹکار سب کچھ کل پیش آنے والے حقائق ہیں، لیکن قرآن نے ان کل پیش آنے والے حقائق کو اس حکمت، اور بلاغت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ آج اسی دنیا میں اور اسی سرزمین پر سنا اور محسوس کیا جارہا ہے، تذکیر وانداز کا یہ حکیمانہ انداز اس قدر بلیغ اور انقلاب انگیز ہے کہ کسی قلب میں قبولِ حق کی ذرا بھی رمق موجود ہو تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ﮨﺸﮧ "یہ وہی جہنم ہے" اس اشارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ان شیطان زدہ مجرمین کو ڈانٹ پھٹکار کی جارہی ہوگی، بھڑکتی ہوئی جہنم ان کے سامنے ہوگی اور ان کو اپنے آتشیں جبڑے کھولے ہوئے چنگھاڑ رہی ہوگی۔ قرآن نے ایک دوسرے مقام پر اس منظر کو وضاحت کے ساتھ بڑے رقت انگیز

انداز میں بیان کیا ہے۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغٰوِينَ ○ وَقِيلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ○ مِنْ دُونِ اللّٰهِ هَلْ يَنْصُرُونَكُمْ اَوْيَنْتَصِرُونَ ○ فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ○ وَجُنُودُ اِبْلِيسَ اَجْمَعُونَ ○ قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ ○ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ○ اِذْ نُسَوِّيكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ○ وَمَا اَضَلَّنَا اِلَّا الْمُجْرِمُونَ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ○

(الشعراء ۹۱ - ۱۰۱)

اور بھڑکتی ہوئی دوزخ ان گمراہوں کے سامنے کھول دی جائے گی اور ان سے کہا جائے گا اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے۔ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ سب اس میں اوپر تلے ڈھکیل دیئے جائیں گے۔ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بھٹکے ہوئے لوگ ان سے کہیں گے۔ اللہ کی قسم ہم تو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے جب کہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے اور وہ مجرم ہی تھے جنھوں نے ہمیں گمراہی میں ڈالا۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔

۸۶؎ انذار کا یہ عمل برابر جاری ہے اپنے اپنے دور میں پیغمبر یہ فریضہ انجام دیتے رہے ان کے بعد ان کے سچے جانشین برابر یہی کام کرتے رہے، اور خدا کی کتاب بھی مختلف انداز سے رقت انگیز مناظر پیش کر کر کے متوجہ کرتی رہی، مگر مسلسل کفر و انکار نے تمہاری عقلوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اور تم خواہشات کے ایسے بندے بن گئے تھے کہ تم کچھ سوچنے سمجھنے کے لئے تیار ہی نہ ہوئے تھے۔ لہٰذا اب اپنی ان حماقتوں کی سزا بھگتو۔ تمہارے اپنے ہی کرتوت ہیں جو تمہارے سامنے آ رہے ہیں۔

۸۷؎ یعنی تمہارا یہ عمل وقتی اور عارضی نہ تھا، بلکہ کفر و انکار تمہارا مستقل شیوہ رہا۔ ہر دور میں رسول آئے۔ کتابیں آئیں۔ رسولوں کے جانشین اور نمائندے تمہیں متوجہ کرتے رہے اور خدا کی بے پایاں رحمت تمہارے سنبھلنے اور سدھرنے کے برابر مواقع فراہم کرتی رہی، لیکن تم اپنے کفر پر ڈٹے رہے۔ اور برابر

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۝

آج ہم ان [۸۹] کے موہنوں پر مہر لگائے دیتے ہیں [۹۰]، ان کے ہاتھ ہمیں بتائیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں

پیغام حق کو جھٹلاتے رہے۔ تمہارے افراد کا بھی یہی عمل رہا اور تمہارے گروہوں نے بھی یہی مستقل رویہ رکھا۔ پھر ان الفاظ کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اولادِ آدم میں سے یہ شیطان کی اغوا کی ہوئی خلقِ کثیر زبان سے پیغامِ حق کی تکذیب وتردید کرتی رہی، بلکہ زندگی بھر یہ لوگ کفر وشرک کے اعمال کرتے رہے، اور یہ کفر وشرک ہی ہے جس نے جہنم کی بھیانک شکل اختیار کرلی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا۝	جس دن انھیں دھکّے دے دے کر آتش
هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝	جہنم کی طرف لے جایا جائے گا، کہا جائے گا یہی
اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ۝	ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ بتاؤ کیا یہ
اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ	جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے۔ جاؤ اب
عَلَیْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝	جھلسو اس کے اندر تم خواہ اسے برداشت کرو۔ یا
(الطور ۱۳-۱۶)	ہائے واویلا کرو۔ دونوں برابر ہے حقیقت یہ ہے کہ تم محض اپنے کرتوتوں کی سزا بھگت رہے ہو۔

[۸۸] یہاں یکایک اسلوب بدل گیا، آیت ۶۴ تک اسلوب خطاب کا تھا۔ چونکہ مجرموں کو مخاطب کرکے ڈانٹ پھٹکار اور لعنت ملامت کی جارہی تھی اور زجر وملامت کے لئے اسلوبِ خطاب ہی کا موزوں ہے۔ زیرِ غور آیت ۶۵ سے غائب کا اسلوب اختیار کیا گیا اس لئے کہ ان آیات میں ان کی بے بسی کی تصویر ہے اور اس کے لئے غائب کا اسلوب ہی موزوں ہے۔

[۸۹] موہنوں پر مہر لگانا، گستاخ مجرمین جب ڈھٹائی کے ساتھ دروغ بیانی اور چرب زبانی کے جوہر دکھانے کا مظاہرہ کرنے لگیں گے، ہر گواہی کو جھٹلانے کی کوشش کریں گے اور عالم الغیب کے سامنے ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولیں گے۔

وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ۝ (الانعام ۲۳) اے اللہ ہمارے آقا تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔

توخدا ان کی زبانیں بند کر دے گا، ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا اور ان سے یہ طاقت سلب کر لے گا کہ اپنی مرضی کے مطابق یہ اپنی زبانوں سے بات کر سکیں۔ اس کے بعد پھر ان کے ہاتھ پیر، ان کی کھالیں گواہی دیں گی۔ ہاتھ پیروں اور دوسرے اعضاء جسم کی گواہی کا ذکر قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ بظاہر ان اعضائے جسم کی گواہی تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے، مگر خدا کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔ اپنے اعضائے جسم کو گواہی دیتے دیکھ کر گستاخ مجرمین بھی اپنی حیرت کا اظہار کریں گے تو اُن کی کھالیں خود ان کو جواب دے کر خاموش کر دیں گی۔

شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ

(حٰمٓ سجدہ ۲۰-۲۱)

ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہم پر گواہی کیسے دی؟ وہ جواب دیں گی اسی خدا نے ہمیں بولنے کی قوت بخشی ہے جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت عطا کی ہے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النور ۲۴)

جس روز ان کی اپنی زبانیں ان پر گواہی دیں گی اور ان کے اپنے ہاتھ اور اپنے پیر گواہی دیں گے کہ یہ کیا کچھ کرتوت کرتے رہے ہیں۔

"ان کی زبانیں گواہی دیں گی" یہ الفاظ پڑھ کر قرآن کے طالب علم کے ذہن میں سوال اُبھر سکتا ہے کہ جب خُدا ان کی زبانوں پر مہر لگا دے گا تو پھر وہ کس طرح گواہی دیں گی اس سوال کا جواب دراصل وہیں موجود ہے جہاں ہم نے مُہر لگانے کی وضاحت کی ہے، اصل بات یہ ہے کہ ابتداءً تو یہ ہیکڑ مجرم اپنی زبان درازی اور جھوٹ کا خوب خوب مظاہرہ کریں گے لیکن جلد ہی اللہ ان کی زبانوں پر مہر لگا دے گا اور پھر یہ اپنی زبانوں سے اپنی مرضی کے مطابق کچھ نہ بول سکیں گے، ان سے یہ اختیار سلب کر لیا جائے گا کہ یہ اپنی زبانوں سے اپنی مرضی کی باتیں کر سکیں۔ اس کے بعد ان کی زبانیں اپنی داستان سنانا شروع کر دیں گی کہ یہ ظالم کس طرح ان زبانوں سے کفر بکتے رہے ہیں کیسا کیسا جھوٹ گھڑتے رہے ہیں اور کیسے کیسے طوفان اٹھاتے رہے ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ ایک ایک چیز ان مجرموں کے خلاف گواہی دیگی نہ صرف ان کے اعضاء جسم ان کے

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۝٦٦ وَلَوْ نَشَآءُ
لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ۝٦٧

اور اگر ہم چاہیں٩٠ تو ان کی آنکھیں میٹ دیں، پھر یہ راستے کی طرف لپکیں تو کہاں سے ان کو راستہ سجھائی دے گا۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کی جگہ پر ہی ان کو پٹ کردیں کہ یہ نہ آگے بڑھ سکیں اور نہ پیچھے لوٹ سکیں ٩١

خلاف گواہ بن کر کھڑے ہوں گے بلکہ خارج کے ماحول کی ہر چیز بھی ان کے جرموں کو بیان کرے گی۔ اور خدا کو ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ ان کے جرم کیا ہیں، نہ اس کی حاجت ہوگی کہ یہ خود اپنی زبانوں سے اپنے جرموں کا اقرار کریں بلکہ یہ اپنے چہرے بُشرے سے الگ پہچان لئے جائیں گے جب خوف سے ان کے مونہوں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہوں گی اُن کے چہرے جھلسے ہوئے ہوں گے۔ یہ شرم و غم میں ڈوبے ہوئے منہ لٹکائے نمایاں کھڑے ہوں گے۔ اور خدا کے غضب کا حال یہ ہوگا کہ وہ گوارا نہ کریگا کہ ان کو منہ لگائے اور ان سے کچھ پوچھے

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝ ... يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ
(الرحمٰن ۳۹-۴۱)

اس دن کسی انسان اور کسی جن سے اس کا جرم پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی ..... مجرم وہاں اپنے چہرے بُشرے سے ہی پہچان لئے جائیں گے اور انھیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔

٩٠ "اور اگر ہم چاہیں تو" یہاں سے یکایک گفتگو کا محل بدل گیا۔ پچھلی آیت تک کچھ ایسا سماں تھا کہ گویا میدان حشر برپا ہے۔ مجرمین عدالت میں حاضر ہیں، خدائے واحد و قہار ان کو پھٹکار رہا ہے۔ اور ان کی عبرتناک بے بسی، ہولناک انجام اور خدا کا انتہائی غیظ و غضب سب کچھ قرآن کا قاری اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے مگر یہاں سے یکایک منظر بدل جاتا ہے۔ عالم تصور کے بجائے عالم واقعہ کی بات شروع ہو جاتی ہے اور مجرمین کو موجودہ زندگی کے بارے میں تنبیہ و تہدید کی جانے لگتی ہے۔ انذار و تنبیہ، اور تذکیر و تفہیم کا یہ نرالا اسلوب اس قدر مؤثر اور دلنشیں ہے کہ اگر دل کی دُنیا بالکل ہی اجڑ نہ گئی ہو، تو آدمی متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

٩١ ان دونوں آیتوں میں ان مجرموں سے کہا یہ جا رہا ہے کہ قیامت میں اپنی بے بسی کا منظر تو تم دیکھ چکے۔ اگر قیامت تمہیں دور کی چیز معلوم ہوتی ہے تو اس دنیا کی موجودہ زندگی کے بارے میں غور کرو، یہاں بھی تم بالکل بے اختیار اور بے بس ہو جن قوتوں اور صلاحیتوں پر تم اترا رہے ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی تمہارے بس میں نہیں

ہے، کائنات کا مالک جب چاہے تم سے یہ قوتیں چھین لے۔ یہ روشن آنکھیں جب چاہے وہ میٹ دے اور تم یوں ہی بھٹکتے پھرو، یہ پاؤں جب چاہے وہ شل کر دے اور تم اپاہج ہو کر رہ جاؤ۔ تم خدا کے دستِ قدرت میں بالکل بے بس ہو پھر آخر کس چیز پر تم غرور و تکبر میں بدمست ہو رہے ہو؟

اس دھمکی اور تنبیہ میں نہایت مؤثر اور دلنشیں تذکیر و تفہیم بھی ہے کہ خدا نے تمہیں یہ بہترین صلاحیتیں اسی لئے دی ہیں کہ ان سے سیدھا راستہ معلوم کرو، اپنے محسن کا شکر ادا کرو۔ لیکن تم ہو کہ مسلسل سرکشی اور بغاوت ہی کئے جا رہے ہو، تمہاری اس ناشکری اور سرکشی کا تقاضا تو یہی ہے کہ خدا تم جیسے ناقدروں سے یہ صلاحیتیں چھین لے اور تمہیں بالکل ہی چٹ کر دے لیکن یہ اس کی بے پایاں رحمت و عنایت ہی ہے کہ وہ پھر بھی تمہیں مہلت دے رہا ہے سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے، اور بار بار متوجہ کر رہا ہے کہ تم کسی طرح ناشکری کی روش چھوڑ کر اس کے شکر گزار بندوں میں شامل ہو جاؤ۔

دانائی اور شرافت کا تقاضا تو یہی ہے کہ تم صرف اس محسن کے وفادار بندے بن کر زندگی گزارو جس نے تمہیں جسم و جان کی یہ شاہکار نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ وہ قادرِ مطلق اگر یہ سب کچھ تم سے چھیننا چاہے تو تم ایک لمحے کے لئے اس سے روک نہیں سکتے۔ روکنا تو درکنار اس کے فیصلے کے خلاف سوچ نہیں سکتے، اور نہ دنیا میں کوئی اور طاقت ایسی ہے جو اس کے فیصلے کو ٹال سکے، یا اس سے کچھ پوچھ سکے، اختیار و اقتدار صرف اسی کے پاس ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ (ابراھیم ۲۷) اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (الانبیاء ۲۳) اس سے باز پرس نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

وہ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے اور اس کے فیصلے کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ (الرعد ۴۱) اور اللہ فیصلے کر رہا ہے کوئی اس کے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے والا نہیں۔

ایک ایسا قادرِ مطلق خدا اگر تمہاری تمام قوتیں اور صلاحیتیں تم سے چھین لینے کا فیصلہ کر لے تو اس کے مقابلے میں کیا ہے کوئی ایسی طاقت جو اس کے فیصلے کو چیلنج کر سکے یا وہ خود تمہیں ایسی قوتیں اور صلاحیتیں دے سکے۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ

اور جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں، اس کی ساخت[۹۲]، کو ہم دھیرے دھیرے پیچھے لوٹا دیتے ہیں[۹۳]۔ تو کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے[۹۴]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ (الانعام ۴۶)

ان سے کہئے، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مُہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کونسا خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہو؟

۹۲ یہاں خلق سے مراد خلقت اور ساخت ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ ساخت کے معنی میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰي كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (طہ ۵۰)

(موسیٰ نے کہا) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راہ بتائی۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم ۳۰)

اللہ کی بدلی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی

نکس اور تنکیس کے معنی ہیں اوندھا کر دینا، پیچھے کی طرف لوٹا دینا، البتہ تنکیس میں تدریج کا مفہوم بھی شامل ہے، یعنی درجہ بدرجہ دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف لوٹا دینا۔ المنکس: اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو سر نیچے کو کئے دھیرے دھیرے چلتا ہے۔ ولادت سے لے کر بڑھاپے تک انسانی زندگی جن مختلف مراحل اور احوال سے گزرتی ہے، اور جس طرح انسان کمزوری سے زندگی کا آغاز کرکے پھر کمزوری اور بے بسی کی طرف لوٹتا ہے، تنکیس کا لفظ اس کی بہترین تصویر کشی کرتا ہے۔

۹۳ "پیچھے لوٹا دیتے ہیں" یعنی انسان کو دھیرے دھیرے پھر اسی کمزوری، ناتوانی اور بے بسی کی حالت میں لوٹا دیتے ہیں، جس میں وہ اپنی ولادت کے وقت تھا، انسان جب پیدا ہوتا ہے تو گوشت کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے وہ چلنے پھرنے اور دوڑ دھوپ کرنے کے قابل ہوتا ہے، پھر جوانی اور شباب کا عالم شروع ہوتا ہے، جسم وجان کی پوری قوتیں زوروں پر ہوتی ہیں اور یہی لمحات زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ آخر کار یہ قوتیں ڈھلنے لگتی ہیں، بڑھاپے کا آغاز ہوتا ہے، اعضا میں کمزوری اور اضمحلال پیدا

ہونے لگتا ہے، اُمنگیں ختم ہوجاتی ہیں۔ ہمت جواب دے دیتی ہے، حوصلے پست ہوجاتے ہیں اور دھیرے دھیرے آدمی کمزوری، بے بسی، اور لاچاری کی اسی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے، جو ولادت کے وقت تھی، اور بوڑھے آدمی کی حالت بالکل بچوں جیسی ہوجاتی ہے۔ قرآن پاک نے انسانی زندگی کے ان احوال اور ادوار کی تصویر کشی اس موثر انداز میں کی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ط (الروم ۵۴)

اللہ ہی ہے جس نے کمزوری کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی پھر اس کمزوری کے بعد تمہیں قوت بخشی پھر اس قوت کے بعد تمہیں کمزور اور بوڑھا کر دیا۔

انسانی زندگی کے ان ادوار سے تو عام طور پر لوگوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے عام طور لوگ گزرتے ہیں۔ مگر خدا کے بعض بندے جو ارذلِ عمر کو پہنچ جاتے ہیں، ان کی مجبوری لاچاری اور بے بسی انتہائی عبرتناک ہوتی ہے، ارذلِ عمر کی تصویر کشی قرآن نے اس انداز میں فرمائی ہے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (الحج ۶)

اور تم میں سے کوئی بد ترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔

۹۴ یعنی زندگی کے ان مختلف مراحل سے دوسروں کو گزرتے دیکھ کر اور خود گزرنے کا تجربہ کر کے بھی ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ ان کی ساری قوتیں اور توانائیاں خدا کے قبضے میں ہیں اور وہ جب چاہے ان کی ساری قوتیں چھین کر ان کو پٹ کر دے۔ دراصل اوپر کی آیات میں جو ہلا ڈالنے والی دھمکی دی گئی تھی، ان احوال و مشاہدات سے اس کی انقلابی دلیل دی گئی ہے۔ اگر آدمی میں سوچنے سمجھنے اور حالات سے عبرت حاصل کرنے کی ذرا بھی صلاحیت موجود ہو تو وہ انسانی زندگی کے ان زبردست تغیرات اور احوال و مشاہدات سے ضرور چند نتائج حاصل کرے گا اور وہ یہ کہ:۔

- جس طرح انسان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، پھر شباب کا دور آتا ہے پھر بڑھاپا آکر تمام قوتوں کو ختم کر دیتا ہے اور آخر کار انسان ختم ہوجاتا ہے، ٹھیک اسی طرح پوری کائنات کا حال ہے، اس کا بھی آغاز ہوا پھر اس کی رونقوں سے نظریں خیرہ ہونے لگیں اور آخر کار ایک دن یہ فنا ہوجائے گی۔
- شباب کی بھرپور قوتوں کو خداوندِ عالم جس طرح بڑھاپے میں مضمحل کر سکتا ہے، اسی طرح یقیناً وہ

اس پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے، انسان کو مفلوج اور بے بس کر دے اور اس کا سب کچھ چھین لے۔

- انسانی زندگی کے یہ احوال و مشاہدات اس حقیقت کی واضح دلیل ہیں کہ دنیا دارِ فنا اور زوال اور موت کے بعد کی زندگی دارِ بقا و دوام ہے۔
- جو خدا زندگی بخش کر اس کو ان مختلف مراحل سے گزارتا ہے وہ یقیناً اس امر پر بھی قادر ہے کہ مرنے کے بعد پھر دوبارہ انسان کو نئی زندگی عطا کرے۔

"تو کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے"؟ اس مختصر سے فقرے میں حیرت و افسوس کا اظہار بھی ہے، اور نہایت پُرسوز انداز میں فہمائش اور تذکیر بھی۔ اگر آدمی اپنی پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک کے مختلف احوال و مشاہدات، اور زندگی کے مختلف ادوار اور مرحلوں پر غور کرے، اور خدا کی بخشی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے تو ممکن نہیں، کہ وہ اس سے عبرت و نصیحت حاصل نہ کرے، لیکن حیرت و افسوس ہے کہ ان کی عقل و خرد صرف دنیا کی رنگینیوں میں کھو گئی ہے، اور حقیقت تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی —— اس حیرت و افسوس کے ساتھ ساتھ اس فقرے میں تذکیر کا پہلو بھی ہے اور نہایت حکمت کے ساتھ عقل و بصیرت کی راہ سے شکر پر اُبھارا گیا ہے، یعنی اگر یہ لوگ عقل و بصیرت سے کام لیں، اپنی مسلسل سرکشی اور خدا کی بے پایاں عنایات پر غور و فکر کریں تو نہایت آسانی کے ساتھ ان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ خدا کی رحمت و عنایت کا دامن بہت وسیع ہے، یہ لوگ برابر خدا کے نمائندے کو جھٹلا رہے ہیں، اس کے ساتھ بدسلوکی کر رہے ہیں، اور خدا کے پیغام کا مذاق اُڑا رہے ہیں، لیکن وہ قادرِ مطلق جو دم بھر میں ان کو نیست و نابود کر سکتا ہے اور جب چاہے ان کا سب کچھ چھین سکتا ہے پھر بھی انھیں سنبھلنے اور ہوش میں آنے کے مواقع فراہم کر رہا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی مہلت دے رہا ہے۔ تو یہ محض اس کا بے پایاں رحم و کرم ہی ہے۔ ایسے مہربان پروردگار کی پیہم عنایت کا کھلا ہوا تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کرتوتوں پر ندامت محسوس کریں، بغاوت و نافرمانی سے باز آئیں، انکار و تکذیب چھوڑ کر اطاعت و انابت کی روش اپنائیں اپنے محسن کا دل کی گہرائیوں سے احسان مانیں اور شکر گذار بندوں کی طرح زندگی گزاریں۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ

۹۵ اور ہم نے ان کو شعر کی تعلیم نہیں دی ۹۶، اور نہ شاعری ان کے شایانِ شان ہی ۹۷
ہے یہ تو محض ایک یاد دہانی ہے اور صاف کھلی ہوئی ایک کتاب ۹۸

۹۵ یہاں سے آخر تک خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں، سورہ کا آغاز قرآن حکیم کی قسم سے کیا گیا تھا، یعنی خود قرآن اور اس کی تعلیمات کو اس حقیقت کے ثبوت اور گواہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا، کہ محمدؐ واقعی خدا کے رسول ہیں، یہاں سے پھر ایک نئے انداز سے اسی مضمون کو دُہرا کر منکرین کو دعوتِ فکر دی گئی ہے، اور ان کے جذبۂ شکر کو ابھارا گیا

۹۶ ہم نے ان کو یعنی نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کو شعر کی تعلیم نہیں دی، یہ دراصل اس بے بنیاد شاطرانہ الزام کی تردید ہے، جو یہ گستاخ منکرین نبی صلّی اللہ علیہ وسلم پر لگا کر خود کو بھی دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے اور دوسروں کو بھی آپؐ کی دعوت پر ایمان لانے سے روکنے کے لئے کوشاں تھے۔

اہلِ عرب کو اپنی زباں دانی، فصاحت و بلاغت اور جادو بیانی پر ناز تھا، وہ اپنے مقابلے میں ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا تصوّر کرتے تھے، اسی لئے خدا نے ان کے درمیان انہی کی زبان میں وہ قرآن نازل فرمایا جو زبان و بیان اور معجزانہ فصاحت و بلاغت کا بے مثال شاہکار ہے۔ قرآن کی حیرت انگیز فصاحت و بلاغت اور غیر معمولی تاثیر و تسخیر کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ اور انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ واقعی یہ بہت اونچا کلام ہے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ قرآن کی یہ غیر معمولی فصاحت و بلاغت اور زبردست تاثیر و تسخیر اس لئے نہیں ہے کہ یہ آسمانی کتاب ہے اور اس کا پیش کرنے والا خدا کا منتخب کردہ رسول ہے۔ بلکہ جس طرح ہمارے یہاں اور بہت سے بلند پایہ شاعر ہیں اسی طرح حضرت محمدؐ بھی انتہائی اونچے درجے کے شاعر ہیں اور قرآن ان کی جادو بیانی ہی کا کرشمہ ہے وہ پوری قوت کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے تاکہ عوام قرآن کی تاثیر و تسخیر سے مرعوب ہو کر اس پر ایمان نہ لانے پائیں۔ اور اس کو شاعری سمجھ کر سنجیدگی سے سوچیں ہی نہیں۔

اس اعتراف اور الزام کے پردے میں دراصل وہ خود کو بھی دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے اور عوام کو بھی دھوکہ دے رہے تھے۔ کہ کسی شاعر کی وجہ سے بھلا ہم اپنا دین و مذہب کیسے چھوڑ دیں، شاعری تو محض دل بہلانے لطف و لذّت لینے اور ذہنی عیش حاصل کرنے کا سامان ہے، اس پر ایمان لاکر اپنے باپ دادا کے معبودوں کو ٹھکرانا کہاں کی دانائی ہے۔ کسی انسان کے من گھڑت کلام کی خاطر اپنے باپ دادا کے دین کو ہرگز نہیں چھوڑا جاسکتا

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (انبیاء ۵)

نہیں بلکہ یہ تو محض پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اس کی من گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝ (الصّٰفّٰت ۳۶)

اور وہ کہتے ہیں کیا ہم ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔

قرآن پاک نے ان کے اس شاطرانہ الزام کی مختلف انداز سے تردید کی ہے اور نہایت موثر انداز میں ان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے

۹۷ اور نہ شاعری ان کے شایانِ شان ہی ہے" یعنی نبی لوگوں کا دل بہلانے اور ذہنی ضیافت کا سامان کرنے کے لئے نہیں بھیجا جاتا۔ وہ لوگوں کی ہدایت کے بلند مقصد کے لئے بھیجا جاتا ہے اس لئے اس کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ شاعری کرے۔ شاعری اس کے عظیم مرتبے سے بہت فروتر چیز ہے۔ کلامِ وحی اور شاعری اور ایک نبی اور ایک شاعر میں جو زبردست فرق ہے، اس کو معمولی فکر و نظر کا عام آدمی بھی دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے فکر و عمل میں سنجیدہ ہو۔ قرآن پاک میں مختلف انداز سے اس فرق کو واضح کر کے ان کے اس الزام کی پوری طرح قلعی کھولی گئی ہے۔ کہیں قرآن کی حقیقت افروز اور انقلاب انگیز تعلیمات کو پیش کر کے کہا گیا ہے، گوشِ ہوش سے سنو اور عقل سے کام لو۔ یہ حقیقت افروز تعلیمات کسی شاعر کی شاعری نہیں ہے بلکہ سارے جہانوں کے پالنے والے کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔ مثلاً سورۂ الحاقہ میں قیامت اور میدانِ حشر کا دل ہلا دینے والا منظر پیش کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ط قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو، اور نہ یہ کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو، یہ سارے جہانوں کے رب کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔

کہیں ان ڈھٹائی کرنے والوں کو بتایا گیا ہے۔ کہ شاعر اور نبی میں زمین و آسمان کا فرق ہے تم نبیؐ کے کلام کو بھی پڑھ سکتے ہو، نبی کی بے داغ زندگی بھی تمہارے سامنے ہے ——— کیا شاعر کی زندگی اور خصوصیات سے تم ناواقف ہو، سورۂ شعراء (۲۲۴ - ۲۲۶) میں اس فرق کو خاص طور پر بہت تفصیل کے

ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہاں تین باتوں پر خاص طور سے غور کرنے کی دعوت دے کر اس غیر معمولی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

● ایک یہ کہ شاعری سے تیار ہونے والے کردار میں اور کلام وحی سے تیار ہونے والے کردار میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے ــــــــ شاعر کے گرد منڈلانے والوں کے اخلاق و کردار کو دیکھو اور پیغمبر کی پیروی کرنے والوں کے اخلاق و زندگی پر نظر ڈالو۔ نبیؐ کے پیش کردہ کلام نے جس سیرت و کردار اور جس اخلاقِ فاضلہ کا گروہ تیار کیا ہے۔ کیا یہ تمہاری سوسائٹی کا جوہر نہیں ہیں، کیا ایسی بے داغ سیرتیں اور ایسی پاکیزہ زندگیاں شاعروں کے پیچھے چلنے والوں میں تم نے کبھی پائی ہیں ــــــــ تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ بڑی فکر کی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے ــــــــ کہ کسی تعلیم کی صداقت اور حقانیت کے لئے اس کے پیروکاروں کی زندگی بھی گواہ اور ثبوت ہوتی ہے۔ قرآن کا ہر قاری یہاں رُک کر سوچے کہ کیا اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی واقعی اسلام کی صداقت و حقانیت کے لئے ثبوت اور گواہ بن رہی ہے!

● دوسری بات یہ کہ شاعر کے قول و فکر کی کوئی راہ متعین نہیں ہوتی ــــــــ کبھی کوئی لہر اُٹھی، تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں۔ کبھی دوسری لہر اُٹھی تو وہی زبان نہایت گندے، اور سفلی جذبات اُبھارنے والی باتیں کرنے لگی۔ کبھی نہایت سنجیدہ اور معقول باتیں ہو رہی ہیں تو کبھی بالکل بے سروپا ناقابلِ فہم اور ہوا میں گرہ لگانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے بالمقابل ایک نبی کی فکر نہایت واضح متعین اور اس کی تقریر نہایت جنچی تلی، دوٹوک اور حقیقت افروز ہوتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ شاعر کے قول و عمل میں کھلا ہوا تضاد ہوتا ہے۔ وہ کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے کہنے کی باتیں کچھ اور ہوتی ہیں، اور کرنے کی باتیں کچھ اور، وہ زہد و تقویٰ کے ایسے مضامین بیان کرے گا کہ دل پسیج جائیں۔ لیکن اس کی اپنی زندگی بے عملی اور عیاشیوں کا نمونہ ہوگی۔ شجاعت اور بہادری کی باتیں کرے گا تو بڑے بڑے بہادروں کے پتّے پانی ہونے لگیں گے۔ مگر خود خون کا ایک قطرہ دیکھ لے تو دورہ پڑ جائے گا۔ سخاوت کے مضامین بیان کرے گا تو حاتم کو شرما دے گا۔ مگر خود کھوٹا سکّہ دینے کا وقت آئے گا تو دل بیٹھنے کا اندیشہ ہونے لگے گا۔ اس کے برخلاف نبیؐ کی زندگی، ایک سچّے اور باعمل انسان کی زندگی ہے۔ حضرت محمدؐ کے قول و عمل میں کوئی موہوم فاصلہ بھی نہیں ہے۔ آپؐ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل کا ایسا حق ادا کرتے ہیں کہ دوسروں کے لئے اس کی نقل کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ اپنی دعوت کے لئے خود آپ کی عملی زندگی ہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ایک

شاعر اور نبی کی زندگی کا یہ عظیم فرق ہر اس شخص کو آسانی سے نظر آسکتا ہے جو انصاف اور سنجیدگی سے واقعی اس فرق کو سمجھنا چاہے۔ پھر طبعی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کو شعر سے قطعی کوئی مناسبت نہ تھی' اور یہ ایک ایسی واضح حقیقت تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اس کو بخوبی جانتا تھا' دوران گفتگو یا دوران تقریر کبھی آپ کوئی شعر نقل فرمانا چاہتے تو یا غیر موزوں پڑھ جاتے یا پھر الفاظ میں الٹ پھیر کر دیتے' حسن بصریؒ کا بیان ہے کہ ایک بار آپؐ نے ایک شعر کے مصرعے کو یوں پڑھا کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اے اللہ کے نبیؐ شاعر نے یوں کہا ہے ـــــ

کفی الشیب وَالاسلام للمرء ناھیا

میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں" اور یہ آیت پڑھی۔ " ہم نے ان کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ اُن کو یہ زیب ہی دیتا ہے

ایک بار حضرت عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کیا آپؐ دوران گفتگو شعر پیش فرماتے تھے؟ فرمایا۔ ہاں ابن رواحہ کے شعر کو کبھی کبھی مثال میں پیش فرماتے تھے۔

سَتُبدِی لَکَ الأیَّامُ مَا کُنتَ جَاهِلاً   وَیَاتِیکَ بِالاَخبَارِ مَن لَّم تُزَوِّدِ

تو آپ اکثر یوں کہتے   وَیَاتِیکَ مَن لَّم تُزَوِّدِ بِالاَخبَارِ

حضرت ابوبکرؓ نے کہا یارسول اللہ مصرعہ یوں نہیں ہے۔ فرمایا " میں شاعر نہیں ہوں اور نہ یہ میرے کرنے کا کام ہے۔"

پھر خاص طور پر اس دور میں عرب کی شاعری میں شہوانی جذبات' شراب و کباب اور عشق بازی کے قصے' نسلی اور قومی غرور' اور اسی قسم کی خرافات کے سوا اور کچھ نہ تھا' اس لئے اس شاعری کے بارے میں آپ کی رائے یہ تھی۔ " تم میں سے کسی شخص کا سینہ پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے" مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مطلقاً شعر کو آپ قابلِ نفرت سمجھتے تھے' کبھی کوئی اچھا حکیمانہ شعر سامنے آتا تو آپ داد بھی دیتے' آپ کا یہ ارشاد مشہور ہے " اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لحکمة" بیشک بعض اشعار میں حکمت ہوتی ہے۔" ایک بار ایک صحابی نے آپؐ کو سو کے قریب اشعار سنائے وہ سناتے رہے اور آپؐ فرماتے رہے "ھیہ اور سناؤ۔

۹۸ " یہ تو محض ایک یاد دہانی ہے"' یعنی نبیؐ کی زندگی پر غور کرو گے تو یہ بات دل میں بیٹھتی چلی جائے گی کہ نبیؐ

لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۷۰﴾

تاکہ وہ ہر اُس شخص کو ڈرائیں ۹۹ جو زندہ ہو ۱۰۰ اور انکار کرنے والوں پر حجت پوری ہو جائے ۱۰۱

ہرگز شاعر نہیں، اسی طرح قرآن پر اور قرآن کی ہدایت افروز تعلیمات پر غور کرو گے تو یہ یقین حاصل ہوتا چلا جائے گا کہ یہ کسی شاعر کی شاعری نہیں بلکہ خدا کا نازل کیا ہوا حقیقت افروز کلام ہے۔ یہاں قرآن کی دو خصوصیات بیان کر کے اس حقیقت کو ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

قرآن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ذکر اور یاد دہانی ہے۔ یہ ان تمام حقائق کی یاد دہانی کراتا ہے جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھے ہیں، یہ اس پوری تاریخ ہدایت کی بھی جو انسانِ اول حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان اچھے بُرے نتائج، ثواب و عذاب اور اچھے بُرے انجام کی بھی یاد دہانی کراتا ہے جو لازماً پیش آکر رہے گا اور انسان چار و ناچار ان نتائج و عواقب سے دوچار ہو گا چاہے وہ کتنا ہی انکار کرے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن ہدایت کی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، اس کے برحق ہونے کے لئے خارج سے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اس کی جامع ہدایات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ انسان کو سیدھی راہ بتانے والا اور قابل عمل محکم اور اٹل احکام و اصول دینے والا جامع صحیفۂ ہدایت ہے۔

۹۹ ڈرانے اور انذار کرنے سے مُراد اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تمہاری موجودہ باغیانہ روش نہیں خدا کے غضب کا مستحق بنا رہی ہے اور تم برابر اپنی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہو، اس تباہی سے بچنے کی صرف یہی راہ ہے کہ تم ہوش میں آجاؤ۔ اور خدا کی اس ہدایت کو قبول کر لو جو خدا کے رسول پیش کر رہے ہیں۔

۱۰۰ "جو زندہ ہو" یہ فقرہ تنبیہ و تذکیر کے نقطۂ نظر سے انتہائی اہم ہے۔ قرآن پاک کا ہر وہ قاری جو قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا حریص ہو، یہاں رُک کر سوچے، کہ اس دعوت و انذار سے فائدہ اُٹھانے کے لئے میرے اندر بھی زندگی کی کوئی رمق ہے یا نہیں، اس طرح کے تنبیہی فقروں کو عرب سوسائٹی پر چسپاں کر کے داستانِ پارینہ سمجھنا اور اپنی زندگی کے بارے میں غفلت کا شکار رہنا زبردست محرومی ہے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن جب فطرت کی آواز ہے اس کی روشن تعلیمات فطرت کے حقائق ہی کی یاد دہانی کراتی ہیں، جب یہ ایک جامع اور واضح صحیفۂ ہدایت ہے تو ہر سُننے والا اسے دل کی آواز سمجھ کر قبول کیوں نہیں کر لیتا، ——؟ یہ فقرہ تنبیہ کے ساتھ ساتھ اس سوال کا تشفی بخش جواب بھی ہے۔

بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، انذار، اور قرآن کی ہدایت تو سب کے لئے ہے لیکن اس انذار و دعوت سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھائیں گے، جن کے دل زندہ ہوں، جن کی روح مُردہ نہ ہوگئی ہو، جنھوں نے اپنی فطرتِ سلیم کو ڈھٹائی، اور سرکشی سے مسخ نہ کر لیا ہو، انذار کرنے والے تو سب کو ڈراوے سناتے ہیں، لیکن ان ڈراووں سے صرف وہی دل پگھلتے ہیں جن میں روحانی زندگی ہو، جن لوگوں میں قلب و روح کی زندگی نہیں ہوتی، جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہوتی ہے وہ اس پر دھیان ہی نہیں دیتے ۔ اور ہدایت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، زندگی حقیقت میں دل کی زندگی ہے، قرآن انہی لوگوں کو زندہ قرار دیتا ہے جو عبرت و نصیحت قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؛ جو لوگ اس صلاحیت سے محروم ہیں وہ حقیقت میں قبر کے مدفون مُردے ہیں، چاہے وہ زمین پر چلتے پھرتے اور دادِ عیش دیتے نظر آئیں۔ اور ایسے مُردوں کے بارے میں نبیؐ کو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ وہ آپ کے انذار اور دعوت سے ہرگز کوئی فیض نہ اٹھائیں گے۔

وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں"

یہ فقرہ قرآن کے ہر قاری کو جھنجوڑتا ہے۔ کہ وہ اپنے بارے میں غور کرے اور اپنے ضمیر سے یہ فیصلہ لے کہ اس کا شمار زندوں میں ہے یا مُردوں میں اگر قرآن کی آیات پڑھ کر اس کا دل لرز جاتا ہے، قبولِ حق کے لئے کھل جاتا ہے اور وہ شخص خدا کی راہِ ہدایت پر نشاط کے ساتھ رواں دواں ہو جاتا ہے تو وہ خدا کا شکر ادا کرے اور استقامت کی دعا کرے کہ خدا کے فضل سے وہ زندہ ہے۔ اور اگر صورتِ حال اس کے برخلاف ہے، تو پھر وہ خدا کی نظر میں مُردہ ہو چکا ہے۔ قرآن کے انذار و دعوت اور ہدایت و نصیحت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے ۔ پھر قرآن اس کو روشنی دینے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس پر حجت پوری کرنے کے لئے ہے۔ یہ اور اسی قسم کے تنبیہی فقروں کو کسی خاص زمانے سے متعلق کر کے یا کسی خاص قوم پر چسپاں کر کے اپنے اندروں سے بے فکر ہو کر غفلت کے ساتھ گزر جانا، قرآن کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور اپنے ساتھ بھی ظلم ہے۔

لـ۱ہ "القول" یعنی خدا کا قول، اس سے مراد خدا کا فیصلۂ عذاب اور خدا کی حجت ہے۔ حق کے مقابلے میں جو لوگ، انکار، ہٹ دھرمی، سرکشی اور بغاوت ہی پر ڈٹے رہتے ہیں، وہ دراصل اپنے اوپر خدا کی حجت پوری کر لیتے ہیں، دُنیا میں بھی اُن کے لئے رسوائی اور تباہی مقدر ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں بھی جہنم ہی ان کا ٹھکانا ہوتا ہے۔ خدا کے قول سے مراد یہی فیصلۂ عذاب ہے جو دنیا میں بھی منکرین کو تباہ و رُسوا کر دیتا ہے، اور آخرت میں بھی جہنم کی ہولناک سزا ان کے لئے مقدر ہو جاتی ہے۔ دنیا میں فیصلۂ عذاب کی مزید تشریح کے لئے اسی سورہ کی آیت، کا حاشیہ

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ﴿٧١﴾

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے[۱] کہ ہم نے ان کے لئے اپنے ہاتھ[۲] کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے چوپائے پیدا کیئے۔ پس وہ ان کے مالک ہیں

شہ دیکھیے۔ اور آخرت میں فیصلہ عذاب کی تشریح کے لئے قرآن کی یہ آیات مطالعہ کیجیئے۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ○ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ○

(ص ۸۲ — ۸۵)

اس نے کہا تیری عزت و جلال کی قسم میں ان سب کو بھٹکا کر رہوں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جنھیں تو نے خالص کر لیا ہو۔ ارشاد فرمایا تو یہ حق ہے اور میرا قول حق ہی ہوا کرتا ہے کہ میں تجھ سے اور ان سب لوگوں سے جہنم کو بھر دوں گا جو انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔

[۲]ئلہ سورہ کے شروع میں قرآن کی پُرزور دعوت اور لرزہ خیز انذار کے بعد آیت ۳۳ اور ۳۵ میں اللہ کی ربوبیت کے زبردست انتظامات اور اللہ کی حیات بخش نعمتوں کا بڑے ہی ولولہ انگیز انداز میں ذکر کر کے انسان کے قلب و دماغ کو متوجہ کیا گیا تھا، کہ سوچو یہ نعمتیں تم سے کیا مطالبہ کرتی ہیں، کہا گیا تھا "أَفَلَا يَشْكُرُونَ" تو کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے یعنی کیا یہ سب کچھ دیکھ کر اور ان سب سے فیضیاب ہو کر بھی یہ شکر رب کے جذبات سے سرشار نہیں ہوتے۔ یہاں خاتمہ سورہ میں اسی تمہید کا مضمون ایک نئے اسلوب سے سامنے لایا گیا ہے۔ قرآن اور وحی الٰہی کے حیات آفریں پیغام کو پیش کرنے کے بعد خدا کی مادی نعمتوں کا نہایت فکر انگیز انداز میں ذکر کرنے کے بعد کہا گیا۔ آخر تم سوچتے کیوں نہیں کیا یہ نعمتیں تم سے مطالبہ نہیں کر رہی ہیں کہ تم اپنے رب کا شکر ادا کرو اور صرف اسی کا شکر ادا کرو، بالکل وہی الفاظ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔ یہاں دوبارہ لائے گئے ہیں

کہا گیا ہے "کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے"، ظاہر ہے ان نعمتوں کو تو سب ہی دیکھ رہے ہیں بلکہ برت رہے ہیں پھر "کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے" کہنے کا کیا مطلب ہے دراصل دیکھنے سے مراد وہ دیکھنا ہے جس کی توقع ایک عقل و شعور والی ہستی سے کی جاتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگ بجا طور پر اس کا ترجمہ کرتے ہیں کیا وہ غور نہیں کرتے — اس آیت کے اوّلین مخاطب قریش ہیں، جو اس وقت دعوت توحید کو ٹھکرا رہے تھے، دراصل وہ ان نعمتوں پر

غور و فکر کی نگاہ نہیں ڈال رہے تھے، قرآن کا کہنا یہ ہے کہ انسان کو خدا نے عقل و شعور اور بصیرت و فہم کی جو جوہری خوبیاں عطا کر رکھی ہیں ان سے یہ لوگ اگر کام لیتے تو ضرور اس نتیجے پر پہنچتے کہ جو ہستی ان پر شب و روز انعام و اکرام کی بارشیں کر رہی ہے اور جس کی ربوبیت کے وجد انگیز انتظامات سے یہ لوگ ہر ہر لمحے فیضیاب ہو رہے ہیں وہ منعم اور محسن ہی اس لائق ہے کہ یہ اس کا شکر ادا کریں اور اس کے شکر میں قطعاً کسی کو شریک نہ کریں۔

کھلی آنکھوں، کھلے کانوں اور کھلے دل کے ساتھ جو انسان بھی خدا کی ان بے پایاں نعمتوں پر غور کرے گا۔ اور حق شناس دل کے ساتھ خدا کی ربوبیت کے ان غیر معمولی انتظامات کا مشاہدہ کرے گا، اس کا سینہ جذبات شکر سے سرشار ہوگا اور اس کا دل گواہی دے گا کہ جس رحیم و کریم ہستی نے اپنی رحمت و حکمت، اور فضل و احسان کے یہ انتظامات کئے ہیں، تنہا وہی اس لائق ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے، جو انسان شب و روز خدا کی نعمتوں سے فیضیاب ہو رہا ہے، لیکن اپنے محسن کے لئے اس کے دل میں شکر کا کوئی جذبہ نہیں ابھرتا، یا نعمتیں تو خدا سے پا رہا ہے اور شکر کچھ اور ہستیوں کا ادا کر رہا ہے تو وہ درحقیقت ان نعمتوں کو دیکھ نہیں رہا ہے۔ وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود فی الواقع اندھا ہے اور قرآن ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر رہا ہے کہ "آخر یہ لوگ دیکھتے کیوں نہیں؟"

۱۰۳ له خدا کے لئے ہاتھ کے لفظ کا استعمال محض استعارے کے طور پر ہے، خدا تو بے مثل ہے، اس کے لئے ہاتھ پیر کے تصور کا سوال ہی نہیں، آیت ۳۵ میں یہی بات ایک دوسرے اسلوب میں کہی گئی تھی، چند نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا تھا وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اور ان چیزوں کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا ہے، یعنی یہ صرف اللہ کے دست قدرت اور اس کی حکمت و ربوبیت کا کرشمہ ہے — یہاں وہی بات راست انداز میں کہی گئی کہ یہ چوپائے ہم نے پیدا کئے ہیں، اور یہ صرف ہمارے دست قدرت کا کارنامہ ہے ان کی پیدائش میں کسی اور کا قطعاً کوئی دخل نہیں، ان چیزوں کا وجود خود گواہ ہے کہ خدا کی قدرت و حکمت نے ہی ان کو وجود بخشا ہے کسی دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ ان کے خالق ہونے کا دعویٰ کرے اور نہ تاریخ میں کسی سرپھرے نے کبھی ایسا دعویٰ کیا ہے یہ خدا کی بے پایاں رحمت و عنایت ہی ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو پیدا کیا اور پھر ان کو انسان کی غلامی میں دے کر انسان کو ان کا مالک بنا دیا، وہ جس طرح چاہتا ہے ان میں مالکانہ تصرف کرتا ہے، وہ انہیں جس طرح چاہتا ہے اپنے کام میں لاتا ہے جب چاہتا ہے، بیچ ڈالتا ہے اور جب چاہتا

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور ہم نے ان کو ان کے بس میں کر دیا ہے ۱۰۴ ؎ کہ کسی پر یہ سواری کرتے ہیں اور کسی کا گوشت کھاتے ہیں ۱۰۵ ؎

ہے خرید لیتا ہے، بلکہ وہ ان کا ایسا مالک ہے کہ جب چاہتا ہے وہ ان کے گلے پر چھری پھیر دیتا ہے۔ اور ان کے گوشت سے لذّت اندوز ہوتا ہے، اور کوئی اس سے یہ پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ تم نے ان کی جان کیوں لی؟ کیا یہ واضح حقائق انسانوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتے، کیا حقیقت کی اس یاددہانی سے سبق لینے کی ضرورت نہیں ہے، کیا ایسی بصیرت افروز تعلیم اور یاددہانی کو شاعری کہنا، ظلم و حماقت نہیں ہے؟

۱۰۴ ؎ "اور ہم نے ان کو ان کے بس میں کر دیا ہے"۔ یہاں "ہم نے" کے لفظ پر خاص طور سے توجہ دلائی گئی ہے۔ ان جانوروں کو انسان کے آرام و راحت اور معاشی ضروریات کے لئے اس درجہ مطیع و سازگار بنانا، خدا ہی کا کام ہے اور یہ اس کی رحمت و ربوبیت ہی کا فیض ہے، اگر وہ نہ چاہتا تو یہ چوپائے نہ انسان کی ضروریات کے لئے کام آتے نہ انسان ان کو اپنے بس میں ہی کر سکتا۔ دُنیا میں کتنے ہی جانور ہیں جو نہ تو انسان کی ضروریات کے لئے کار آمد ہیں اور نہ انسان ان کو چوپایوں کی طرح اپنے بس میں ہی کر سکتا ہے۔ ان چوپایوں کا مطیع فرمان اور غلام ہونا خدا کی رحمت و ربوبیت کا فیض بھی ہے اور اس کی حکمت کی نشانی بھی، کیسے کیسے عظیم الجثہ قوی ہیکل اور انسان سے کئی گنا زیادہ طاقت رکھنے والے چوپائے انسان کے اشارے پر حرکت کرتے ہیں، اور وہ بزور اور بجبر ان سے کام لیتا ہے اور مجال نہیں کہ وہ منہ موڑ سکیں، ایک بچہ عظیم الخلقت اونٹ اور ہاتھی پر سواری کرتا ہے اور جدھر چاہتا ہے اپنی مرضی کے مطابق اسے ہانکتا ہے۔ اونٹوں کی لمبی لمبی قطاروں کی نکیل ایک بچے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور پوری قطار کو وہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے، مجال ہے کہ یہ اونٹ ذرا سرتابی کر سکیں۔

۱۰۵ ؎ یہ فقرہ دراصل ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ ہی کی تفصیل ہے۔ یعنی اللہ نے ان چوپایوں کو اس طرح انسان کے بس میں کر دیا ہے کہ کسی پر وہ سواری کرتا ہے اور کسی کا گوشت کھاتا ہے۔ جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھ کر بھی سواری کی جاتی ہے اور ان کو گاڑی ٹانگوں میں جوت کر بھی سواری کی جاتی ہے اور ان پر سواری کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے بوجھ بھی لاد کر ڈھوئے جاتے ہیں، دوسرے مقام پر ہے:

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ   اور وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾

اور ان چوپایوں میں ان کے لئے اور طرح طرح کے فائدے اور مشروبات ہیں،[۱۰۶] تو کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے[۱۰۷]

لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ (النحل ۷، ۸)

پرلے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ اس نے خچر، گھوڑے، گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔

۱۰۶ یعنی سواری اور گوشت کے علاوہ بھی ان سے بہت سے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں ان کی کھالوں سے خیمے، گرم اور قیمتی لباس، ٹوپیاں دستانے اور طرح طرح کے مفید اور دیدہ زیب ضرورت کے سامان بنائے جاتے ہیں۔ ان کے بالوں اور ان کے اُون اور روئیں سے نوع بنوع نفیس، آرام دہ اور زینت بخش چیزیں تیار کی جاتی ہیں دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ۝ (النحل ۸۰)

اور اس نے تمہارے لئے جانوروں کی کھالوں سے ایسے مکان پیدا کئے جنہیں تم سفر اور قیام دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو، اس نے جانوروں کے اون، روئیں اور بالوں سے تمہارے لئے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کیں جو زندگی کی مہلتِ مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں،

۱۰۷ تو کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اس فقرے کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ کیا ایسی زبردست نعمتوں کو دیکھ کر اور شب و روز ان سے فیضیاب ہو کر بھی ان کے اندر شکر گزاری کے جذبات نہیں اُبھرتے، کیا نعمتیں پا کر آدمی

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ

اس کے برخلاف انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنالئے ہیں اس امید میں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی مدد نہ کرسکیں گے

پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، کیا یہ نعمتیں آدمی سے کچھ مطالبہ نہیں کرتیں، منعم کے انعامات سے فیض اٹھاکر اس کے شکر کے جذبات سے سرشار ہونا عقل وشرافت کا بھی تقاضا اور انسانی فطرت کا بھی۔ خدا کی نعمتوں سے شب وروز فائدہ اٹھانا اور اس کا شکر نہ ادا کرنا بدترین قسم کی ناشکری بھی ہے اور جہالت وحماقت بھی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس نے یہ سب نعمتیں بخشی ہیں تنہا وہی شکر کا مستحق ہے۔ یہ تو زبردست قسم کی نادانی اور ظلم ہے کہ منعم تو کوئی ہو اور آدمی دوسروں کا شکر ادا کرے۔ یہ حماقت کے ساتھ ساتھ اپنے محسن ومنعم کے ساتھ زبردست گستاخی بھی ہے اور صریح ظلم بھی۔

اگر آدمی نے اپنی فطرت مسخ نہ کرلی ہو اور اس کی عقل بالکل ہی نہ ماری گئی ہو تو وہ یہ حرکت کبھی نہیں کرسکتا کہ اس پر انعام واکرام کی بارشیں تو خدا کی طرف سے ہو رہی ہیں اور وہ شکر کچھ دوسری ہستیوں کا ادا کر رہا ہے۔ یہاں شکر سے مُراد توحید ہے —— ان نعمتوں کا واضح اور صریح مطالبہ ہے کہ آدمی اپنے منعم کی توحید پر ایمان لائے صرف اسی کا شکر گزار بندہ بن کر رہے۔ اور شرک سے اپنی زندگی کو آلودہ نہ کرے —— یہی قرآن کی دعوت اور یاد دہانی ہے۔ ایسی واضح اور فطری تعلیم کو شاعری کہہ کر گریز کی راہیں تلاش کرنا اپنے ساتھ بھی ظلم ہے، خدا کے اس کلام کے ساتھ بھی ظلم ہے اور اپنے محسن رب کے ساتھ بھی۔

ﷺ یہاں جو "وَ" استعمال کیا گیا ہے اس کا مفہوم ہم نے "اس کے برخلاف" کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے یعنی خدا کی شانِ ربوبیت اور اس کی بے پایاں نعمتوں کا حق تو یہ تھا کہ یہ تنہا اللہ کا شکر ادا کرتے، اور اس کی توحید پر ایمان لاکر اس کے تقاضے پورے کرتے —لیکن ان ناشکروں نے اس کے برخلاف کیا یہ کہ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی بارگاہیں سجانے اور ان کے آستانوں پر رسوم عبادت ادا کرنے میں لگ گئے اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہوگئے کہ یہ بے جان پتھر آڑے وقت میں ان کے کام آئیں گے ان کی بگڑی بنائیں گے۔ ان کے سر آئی مصیبت کو ٹالیں گے، اگر اللہ نے کبھی ان کے کرتوتوں پر غضبناک ہوکر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کرنا چاہا تو یہ جھٹ ان کی مدد کو آکھڑے ہوں گے۔ اور اللہ کو ایسا فیصلہ کرنے سے روک دیں گے

مشرکین دُنیا میں بھی اپنے معبودوں سے مدد و حمایت کی توقع رکھتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ ان کا تصور یہ ہے کہ ان کے یہ معبود اپنے تصرف و اختیار سے ان کے سر آئی بلائیں ٹال دیتے ہیں۔ ان کے رزق میں کشادگی کرتے ہیں۔ انہیں ہر طرح کی آسائشیں اور سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں، انہیں خوش حالی سے نوازتے ہیں اور ان کے پُشت پناہ بن کر ان کی حمایت کرتے ہیں ——

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ○

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ معبود قرار دے لئے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے پُشت پناہ ہوں۔

مشرکین اہلِ ایمان سے کہتے ہیں دیکھو کس کی زندگی میں ساز و سامان اور شان و شوکت زیادہ ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ○

اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے وہ ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے کون اپنے مرتبے اور سوسائٹی کے اعتبار سے بڑھ ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا زعم یہ تھا کہ دوبارہ اٹھائے گئے تو وہاں بھی مال و دولت اور سوسائٹی کے اعتبار سے ہم ہی بڑھ چڑھ کر ہوں گے۔

وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ○ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ○

اور اس کا زعم یہ ہے کہ میں آخرت میں مال و دولت اور اولاد سے نوازا جاؤں گا۔ کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا خدائے رحمٰن سے کوئی عہد کر لیا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ وہاں ہماری سفارش کر کے ہمیں بخشوائیں گے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں گے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔

ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کا قرب حاصل کرائیں گے۔

۱۰۹ یہ مشرکین کے زعمِ باطل کی قطعی تردید ہے۔ اور اس کا تعلق بھی دونوں جہان سے ہے، دُنیا میں یہ جھوٹے معبود بھلا کیا مدد کریں گے، یہ تو خود اپنی بقا، اپنی حفاظت اور اپنی خدائی جمانے کے لئے ان کے محتاج ہیں، یہ لوگ اگر ان کے درباروں کو نہ سجائیں، ان کے آستانوں پر رسوم عبادت نہ ادا کریں، ان کے آستانوں سے متعلق افسانے گھڑ گھڑ کر ان کا پروپیگنڈہ نہ کریں اور ان کی شان بڑھانے اور قائم رکھنے کے لئے مستقل طور پر ان کے آستانوں پر

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ

بلکہ یہ لوگ ان کے لشکر بنے ہوئے حاضر کئے جائیں گے تو جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں [۱۱۲] وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ چھپاتے ہیں، اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں [۱۱۳] کیا انسان [۱۱۴] غور نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پانی کی بوند سے پیدا کیا [۱۱۵]

حاضر باش غلاموں کی طرح حاضری نہ دیں تو ان کی خدائی کے ٹھاٹ نہ جم سکیں، یہ خالق کائنات کی خدائی تو ہے نہیں کہ آپ اپنے بل بوتے پر قائم ہو، ان کی خدائی کے ٹھاٹ تو خود پرستاروں کے دم سے ہی ہیں۔ رہا آخرت میں مدد کا سوال تو وہاں کس کی مجال ہے جو خدائے واحد و قہار کے حضور لب کشائی کر سکے، وہاں ہر ایک اپنے انجام کے لئے داورِ محشر کے فیصلے کا منتظر ہوگا۔ اور یہ مشرکین جس طرح دُنیا میں اپنے معبودانِ باطل کے حاضر باش غلام بنے ہوئے تھے وہاں بھی اپنے معبودوں کے لشکر کی حیثیت سے حاضر ہوں گے اور اپنے انجام کا فیصلہ سُننے کے منتظر ہوں گے

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ — تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم پرستش کر رہے ہو جہنم کے ایندھن ہو اور تم سب کو اسی گھاٹ اُترنا ہے۔ (الانبیاء ۹۸)

[۱۱۲] دعوتِ حق کی راہ روکنے اور تحریک اسلامی کو ناکام بنانے کے لئے یہ لوگ انتہائی رکیک حرکتوں پر اُتر آئے تھے جس کی صداقت و امانت پر مکے کا ذرّہ ذرّہ گواہ تھا اس کو کبھی شاعر و کاہن کہتے، کبھی خبطی اور مجنوں کہتے، کبھی سحرزدہ اور افترا پرداز گردانتے۔ ان کے بے بنیاد الزامات، اور گستاخیوں کا کچھ ذکر اس سورت میں بھی ہے، اور دوسری مکّی سورتوں میں بھی بہت تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ سورہ حاقہ میں ہے

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ	اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔
قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝	تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ	اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔

قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ — تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔

کبھی وہ اس پیغام کو من گھڑت باتیں کہہ کر جھٹلاتے، کبھی پچھلوں کی روایتی کہانیاں کہہ کر رد کرتے، کبھی کہتے کہ کچھ لوگ اگر آپ کو سکھاتے اور پڑھاتے ہیں، سورہ فرقان میں ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ۝ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝

(الفرقان ۴، ۵)

اور یہ انکار کرنے والے کہتے ہیں، یہ فرقان سراسر من گھڑت ہے جسے اس شخص نے خود ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے، بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں اور کہتے ہیں یہ پُرانے لوگوں کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کرتا ہے اور وہ صبح و شام اس کو سُنائی جاتی ہیں۔

خدا کی اس دعوت کو یہ لوگ کبھی شاعرانہ تخیلات سے تعبیر کرتے — کبھی کاہنوں کے وہم و خیال کی کارروائی بتلاتے۔ کبھی سحر و جنون کی بات قرار دیتے — اور اس طرح یہ اس سراسر حق کو بے وزن کرنے اور ہوا میں اڑانے کی حماقتیں اور گستاخیاں کرتے۔

اللہ رسول کو تسلی دی گئی آپ اطمینان سے اپنا کام کرتے رہیں، یہ جو باتیں بنا رہے ہیں ان کا اثر نہ لیں، غمزدہ نہ ہوں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالفینِ دعوت کی ان بے ہودہ باتوں اور گستاخیوں پر رنجیدہ اور غمگین ہونا ایک فطری امر تھا، اس لئے بھی کہ آپ کی ذات پر ان ناروا حملوں اور رکیک الزامات سے آپ کی شخصیت مجروح ہوتی تھی — لیکن دراصل آپ کے رنج و غم کی وجہ یہ تھی کہ کہیں یہ پروپیگنڈہ دعوتِ حق کی راہ نہ مار دے، تحریک اسلامی ناکام نہ ہو جائے اور جو سعید روحیں اس حق کو قبول کر سکتی ہیں ان کے لئے یہ پروپیگنڈہ رکاوٹ نہ بن جائے خدا نے اپنے رسول کو تسلّی دی اور اطمینان دلایا کہ آپ کو غمگین ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا کام صرف تبلیغ و دعوت ہے، دعوت کو کامیاب بنانا اور اس کے لئے حالات کو ساز گار کرنا یہ ہمارا کام ہے۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ یہ چھپا رہے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کر رہے ہیں۔

دعوتِ حق کے خلاف علانیہ جو پروپیگنڈا یہ کر رہے ہیں، حق سے روکنے کے لئے یہ جو تدبیریں اور کوششیں

کر رہے ہیں۔ اس سے بھی خدا خوب واقف ہے اور یہ چھپا کر کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں اس سے بھی خدا واقف ہے ---- یہ جو خفیہ سازشیں کر رہے ہیں اپنی بھی مجلسوں اور مخصوص محفلوں میں جو اسکیمیں بنا رہے ہیں اس سے بھی خدا بخوبی واقف ہے۔ نیز وہ جانتا ہے کہ لوگ جو بے ہودہ الزامات لگا رہے ہیں اور جو بے بنیاد پروپیگنڈہ کر رہے ہیں ان کے ضمیر خود اس کے قائل نہیں ہیں، وہ اپنی مخصوص محفلوں میں ایک دوسرے کے سامنے اقرار کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹ ہے ---- ایسا پروپیگنڈہ اور ایسے بے بنیاد الزامات لگانے والے جنہیں اپنے الزامات کی حقیقت اور اپنے پروپیگنڈہ کے کھوکھلے پن پر خود بھی یقین ہو، بھلا کبھی کامیاب ہوسکتے ہیں اور ایسے لوگ کبھی حق کو ناکام بنا سکتے ہیں ---- آپ اس فکر و غم سے ذہن کو خالی کر کے بس اپنا کام کرتے رہیں اور خدا پر اطمینان رکھیں وہ کھلے چھپے کا جاننے والا آپ کے مخالفین سے نمٹنے کے لئے بالکل کافی ہے۔

ﷺ انسان کا لفظ یہاں اصلاً قریش کے ان لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا جو رسول سے برسرِ پیکار تھے، ان کو اہمیت نہ دینے اور ان کی طرف سے بے توجہی کا اظہار کرنے کے لئے عام لفظ "انسان" استعمال کیا گیا، پھر یہ حکمت بھی پیشِ نظر ہے کہ انسانی نسل رہتی زندگی تک چلتی رہے گی اور قرآن کی یہ تنبیہ و تذکیر انسانی نسل سے پیدا ہونے والے ہر اس کردار کے لئے ہے جو اس عمل کا مظاہرہ کرے گا۔

قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں، کہ ایک عام سا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے مُراد کوئی خاص گروہ یا خاص کردار ہوتا ہے اور اس استعمال میں کوئی گہری حکمت یا بلاغت ہوتی ہے، مثال کے طور پر سورۂ مریم کی آیت ۶۶ پر غور کیجئے۔

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا	اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔

یہاں لفظ انسان عام ہے، لیکن یہ قطعی حقیقت ہے کہ اس سے مُراد وہ مشرکین عرب ہی ہیں، جو رسول اور رسول کے ساتھیوں کی مخالفت کر رہے تھے، اور اختلاف کی بنیاد یہی عقیدۂ آخرت تھا، عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے والے اور اس کی دعوت دینے والے بھی انسان ہی تھے، لیکن یہاں قرآن نے جو لفظِ انسان استعمال کیا ہے اس سے وہ ہرگز مراد نہیں ہیں بلکہ متعین طور پر وہی مشرک مراد ہیں جو آخرت کا انکار کر رہے تھے اور یہاں بھی اس عام لفظ کے استعمال میں یہ بلاغت ہے کہ یہ لوگ ہرگز التفات کے لائق نہیں ہیں۔

فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ

پھر وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کھڑا ہوا - اور وہ ہم پر پھبتی چُست کر رہا ہے[۱۱۴] اور اپنی پیدائش کو بھول گیا[۱۱۵] کہتا ہے بھلا ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا[۱۱۶] جب کہ وہ

[۱۱۳] حقیر اور بے وقعت بوند سے جس ہستی نے ایک ایسا انسان بنا کھڑا کیا جو نہ صرف کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے، بلکہ اپنے عقل و شعور اور بحث و استدلال سے حیرت انگیز کارنامے انجام دے رہا ہے - کیا وہ خالق اس پر قادر نہیں ہے - کہ مرنے کے بعد پھر اس انسان کو زندہ کر سکے؟ آخر اس معاملے میں ہی کیوں انسان کی عقل و فکر کند ہو جاتی ہے

[۱۱۴] "ضرب مثل،، فکر انگیز مثال بیان کرنے اور حکمت کی بات کہنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور موقع کے لحاظ سے طنز کرنے، پھبتی چُست کرنے اور نارواباتیں منسوب کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے قرآن میں دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں،

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِيْ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا

(سورۂ ابراہیم ۲۴-۲۵)

کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہو اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہوں، ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے پھل دے رہا ہے۔

یہاں ضرب مثل کلمۂ طیبہ کی فکر انگیز مثال بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے - ایک دوسرے مقام پر شرک کی کمزوری اور کھوکھلے پن کو واضح کرنے کے لئے ارشاد ہوا ہے -

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ، إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللَّهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهُ ط وَإِنْ

اے لوگو! ایک تمثیل پیش کی جاتی ہے۔ غور سے سُنو، جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی

يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ۔ (الحج ۷۳)

چیز چھین کرلے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے، مدد چاہنے والے بھی بودے اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی بودے۔

پھبتی چُست کرنے اور کسی کی طرف ناروا بات منسوب کرنے کے لئے بھی ضرب مثل کا استعمال قرآن میں کئی جگہ ہے۔ منکرین حق رسول پر طرح طرح کے الزامات دھرتے۔ ناروا باتیں منسوب کرتے، اور طنز و تشنیع کا نشانہ بناتے، آپ کو افتراپرداز کہتے، سحرزدہ بتاتے، آپ کے پیغام کو پہلے لوگوں کی من گھڑت روایتی کہانیاں قرار دیتے۔ فقرے کستے کہ اپنی ضروریات کے لئے بازاروں میں گھومنے والا، اور عام انسانوں کی طرح کھانے پینے والا انسان اور زعم یہ کہ میں رسول ہوں، مالک کائنات کا رسول اور یہ حال، یہ رسول ہوتے تو ان کے ہمراہ ان کی حفاظت کے لئے اور ان کے پیغام کو جھٹلانے پر ڈرانے دھمکانے کے لئے ان کے ساتھ طاقتور فرشتہ ہوتا، ان کے پاس دولت ہوتی، سرسبز باغ ہوتا جس میں یہ ٹھاٹ کرتے، ان کی ان پھبتیوں، فقرے بازیوں، کٹ حجتیوں اور ناروا باتوں کے بعد کہا گیا:۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ (الفرقان آیت ۹)

دیکھو یہ تمہاری طرف کیسی کیسی ناروا باتیں منسوب کر رہے ہیں

زیر غور آیت میں بھی ضرب مثل پھبتی چُست کرنے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ گستاخ خدا کو انسان کی طرح عاجز اور بے بس سمجھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ بھلا گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ یہ اللہ قادر و توانا کی طرف عاجزی، بے بسی اور کمزوری کی نسبت کر رہے ہیں اور اسے انسان پر قیاس کر رہے ہیں جو مخلوق ہے، خالق کائنات تو وہ عظیم ہستی ہے، جس کی قوت و قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ (الانبیاء ۲۱)

پس پاک ہے عرش کا مالک ان باتوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں۔

۱۱۵ اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ یعنی اپنے خالق کے منہ کو آنے والا اور قادر و توانا خدا پر پھبتی چُست کرنے والا، اسی لئے یہ پھبتی چُست کر رہا ہے کہ وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، وہ اس حقیقت کو سامنے رکھے کہ وہ کچھ نہ تھا، محض ایک بے جان بوند سے خدا نے اسے جیتا جاگتا انسان بنایا، پھر اُسے حیرت انگیز

قوتوں اور صلاحیتوں سے آراستہ کیا تو کبھی اس طرح کی بات اپنے رب کی شان میں نہ کہے، آخر عدم محض سے وجود میں لانے کی قدرت رکھنے والے خالق کے بارے میں وہ یہ تصور کیوں رکھتا ہے کہ وہ موت دینے کے بعد دوبارہ پھر اسے زندہ نہیں کر سکتا۔

اَوَ لَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْئًا ○ (مریم ۶۷)	(دوبارہ زندگی کے منکر) انسان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ ہم اس کو پہلے پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔

پھر اس فقرے میں نہایت حکمت کے ساتھ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑا بھی گیا ہے، کہ اپنے رب کے بارے میں انسان کا یہ ناروا سلوک اور ناشکری کی روش اس لئے ہے کہ وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ بے جان بوند سے پیدا ہوا تو کیسا بے بس اور ناتواں تھا، خدا نے اس کی حفاظت اور پرورش کے کیسے کیسے انتظامات کئے۔ کیسی کیسی نعمتیں اس کے لئے فراہم کیں مگر خدا کی ربوبیت کی آغوش میں جب یہ پل کر جوان ہوا اور شعور کی قوتیں شباب پر آئیں تو اب یہ اپنے محسن آقا کو عاجز و ناتواں کہتا ہے، اس کی قدرت کا انکار کرتا ہے، دوبارہ پیدا کرنے سے اس کو عاجز و درماندہ قرار دیتا ہے، اور اس کے بھیجے ہوئے رسول اور پیغام کا مذاق اڑاتا ہے، کیا اس کے لئے کسی طرح بھی یہ زیبا ہے! شرافت، انسانیت، دانائی، اور عقل و شعور کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے محسن کا شکر گزار اور تابع فرمان بن کر زندگی گزارے۔ اور اس کے پیغام کو سینے سے لگائے۔

۱۱۶ "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا" یہ سوال نہیں بلکہ اظہار تعجب و انکار ہے۔

فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ○ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ○ (قٓ ۲، ۳)	منکرین کہتے ہیں یہ تو عجیب بات ہے کہ جب ہم مر جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے) یہ واپسی تو بڑی دور کی بات ہے۔

حضرت مجاہد، قتادہ، عکرمہ، اور سدی کی روایات اور سعید بن جبیر اور ابن عباس رضی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے سردار حضور کی خدمت میں آئے، کسی وقت ابی ابن خلف آیا اور کسی

وَهِیَ رَمِیۡمٌ ﴿۷۸﴾ قُلۡ یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ؕ وَ ہُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمُۨ ﴿۷۹﴾

بوسیدہ ہو چکی ہوں۔ ان سے کہئے ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار ان کو
پیدا کیا تھا[۱۱۷] اور وہ ہر مخلوق سے اچھی طرح واقف ہے[۱۱۸]

وقت عاص بن وائل آیا۔ قریش کے یہ سردار قبرستان سے ایک گلی سڑی ہڈی ہاتھ میں لئے آئے اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہاتھ سے مسل کر چور چور کیا اور ہوا میں اڑاتے ہوئے بولے اے محمد کیا تمہارا زعم یہ ہے کہ خدا ان بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ خدا کے رسولؐ نے فرمایا " ہاں اللہ تمہیں موت دے گا۔ پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تمہیں جہنم میں داخل کرے گا" یہ واقعہ دورِ رسالت میں پیش آیا، مگر یہ کردار انسانوں میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ وہ یہ پورا عمل اور اظہار زبان سے کریں یا نہ کریں، بہر کیف زبانِ حال سے وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بے عقلوں نے خدا کی قدر ہی نہیں پہچانی۔

[۱۱۷] قرآنِ کریم میں بالعموم پہلی تخلیق سے امکانِ آخرت پر دلیل دی گئی ہے۔ اس موقع پر بھی یہی دلیل دی گئی ہے، جو لوگ یہ دیکھ رہے ہیں اور مان رہے ہیں کہ انسان کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے وہ آخر اس پر کیوں تعجب کر رہے ہیں، کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ پہلی تخلیق کو ماننے کے بعد آخر دوسری تخلیق کیوں ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ یہ عقل کے دشمن سوچتے کیوں نہیں کہ پہلی بار کسی چیز کو پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے یا دوسری بار۔ اگر ایک آرٹسٹ نقشِ اوّل کے مقابلے میں نقشِ ثانی زیادہ سہولت کے ساتھ اور زیادہ بہتر بنا سکتا ہے اور بناتا ہے تو پھر قادرِ مطلق کے لئے یہ بات کیوں ناممکن ہے۔ پہلی بار پیدا کرنے سے اگر وہ عاجز نہیں رہا ہے تو دوسری بار اس کی قدرت و قوت کیوں جواب دے جائے گی۔

اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ (ق ۱۵) کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے ہیں؟

ظاہر ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ خالق پہلی تخلیق سے عاجز رہا تو پھر دوبارہ پیدا کرنے سے وہ کیوں عاجز رہے گا، جب کہ دوبارہ پیدا کرنا تو زیادہ آسان ہے

وَ ہُوَ الَّذِیۡ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ وہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی

يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ط	دوبارہ زندگی بخشے گا اور یہ اعادہ اس کے
(الروم ۲۷)	لئے آسان تر ہے۔

جو ہستی عدمِ محض سے انسان کو وجود میں لاسکتی ہے، وہ موت کے بعد آخر دوبارہ کیوں زندہ نہیں کرسکتی۔ جب کہ دوسری بار پیدا کرنا ظاہر ہے کہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔

۱۱۵ وہ ہر مخلوق سے اچھی طرح واقف ہے، یہاں خلق مخلوق کے معنیٰ میں ہے، یعنی اللہ کو اپنی ہر ہر مخلوق کے بارے میں کامل علم ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مُردہ زمین میں دفن ہو کر مٹی میں رل مِل گیا ہو، یا آگ میں جل کر اور راکھ بن کر ہوا میں اُڑ گیا ہو، کسی درندے نے اسے پھاڑ کھایا ہو اور اس کا فُضلہ بن چکا ہو، یا مچھلیوں کی غذا بن کر سمندر کے پانی میں گھُل مِل گیا ہو، بہر کیف خدا کو اس کا پورا پورا علم ہے، اس کے علم سے اس کے جسم کا کوئی ریزہ باہر نہیں ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے آخر وہ کیسے واقف نہ ہوگا۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ	کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟
اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○	وہ تو انتہائی باریک بیں اور خبر رسی کے
(سورۂ ملک ۱۴)	ساتھ خبر رکھنے والا ہے۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جب جسم کے ریزے اس طرح بکھر جائیں گے، اور بظاہر ناپید ہو جائیں تو وہ کیسے ان کو یکجا کر کے دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ ریزے کہیں بھی ہوں، کسی حال اور کسی شکل میں ہوں، خدا کو ان کا علم ہے —— اور پھر مبالغے کا صیغہ علیم استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی خوب اچھی طرح علم ہے۔ وہ جب چاہے گا۔ ان ذرّوں کو اکٹھا کر کے جِلا اٹھائے گا۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ	ہمارے علم میں ہے زمین جو کچھ ان کے جسم
وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيْظٌ ○	سے کھاتی ہے۔ اور ہمارے پاس کامل
(ق ۔ ۴)	ریکارڈ رکھنے والی کتاب ہے۔

پھر اس فقرے کا اوپر کی ان آیات سے بھی گونہ ربط ہے، جن میں خدا کی ربوبیت اور اس کی بے پایاں نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ اپنی ہر مخلوق سے اچھی طرح واقف ہے کہ کون اس کی کِن کِن نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے اس کی شانِ ربوبیت سے کس طرح فیض یاب ہو رہا ہے۔ کون نعمتوں سے فیضیاب ہو کر شکر گزار بندے کی روش اختیار کئے ہوئے ہے اور کون ان نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے باوجود

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ

وہی ہے جس نے تمہارے لئے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے آگ جلاتے ہو [۱۱۹]

ناشکری کی روش اپنائے ہوئے ہے۔ خدا کی ربوبیت اور اس کے علم کا واضح تقاضا ہے کہ ایک روزِ حساب آئے اور خدا اپنے بندوں سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھے۔ شکرگزاروں کو انعام سے نوازے اور ناشکروں کو ان کے کرتوتوں کی سزا دے۔

کس قدر حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ عقل و شعور رکھنے والا انسان شب و روز خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھیں بھی ہیں، سوچنے والا دماغ بھی ہے اور محسوس کرنے والا دل بھی۔ لیکن کسی وقت بھی وہ یہ نہیں سوچتا کہ ایک روز مجھے انعام دینے والے کو حساب بھی دینا ہوگا۔ میرا منعم مجھ سے ان نعمتوں کے بارے میں سوال بھی کرے گا۔ اگر آدمی غور کرے تو روزِ حساب کی ضرورت کا داعیہ اس کے اندروں سے خود اُبھرنا چاہیئے اور دل و دماغ کا یہ فیصلہ ہونا چاہیئے کہ روزِ حساب اللہ کی ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے —— مگر یہاں حال یہ ہے کہ اس فطری جذبے کی یاد دہانی بھی کرائی جاتی ہے، اور خدا کا نمائندہ بڑی دل سوزی سے متوجہ بھی کرتا ہے۔ لیکن خدا سے غافل انسان اس پر کان نہیں دھرتا، اور دھڑلے سے اپنے رب کی نافرمانی کئے جا رہا ہے۔ بہر کیف کسی کے انکار سے حقیقت ہرگز نہیں بدلتی، اللہ انسان کو زندہ کرے گا۔ نہ اس کے جسم کا کوئی ریزہ اس کے علم سے مخفی ہے اور نہ اس کے کرتوت اور خیالات و رجحانات خدا کے علم سے باہر ہیں، وہ ہر مخلوق کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔

[۱۱۹] ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کرنا خدا کی بے پناہ قدرت کا ایک عبرت آموز کرشمہ ہے۔ دوبارہ زندگی کے امکان کو ذہن نشین کرانے کے لئے یہ دلیل پچھلی دلیل کو مزید تقویت پہنچانے والی ہے۔

صحرا کے مسافر بدوؤں کو جب آگ کی ضرورت پیش آتی، تو وہ مرخ اور عفار دو درختوں سے مسواک جیسی دو ٹہنیاں کاٹتے اور مرخ کو عفار پر مارتے تو اس سے چقماق کی طرح آگ جھڑنے لگتی اور اس طرح یہ ضرورتمند آگ

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی

کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے پر قادر نہیں، کیوں نہیں

روشن کر لیتے۔

اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (الواقعہ ۱۷-۷۳)

کیا تم نے غور کیا یہ آگ جو تم سلگاتے ہو اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں، ہم ہی نے اس کو ذریعہ یاد دہانی اور مسافروں کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے۔

مرخ اور عفار سے آگ سُلگانے والے صحرائی مسافر آگ سے کھانا بھی تیار کرتے روشنی بھی حاصل کرتے اور تاپنے کا بھی فائدہ اٹھاتے، رات میں درندوں کو بھگانے کا کام لیتے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ دکھانے کے لئے بھی اسے روشن رکھتے۔ اس لئے قرآن نے اس کو مسافروں کے لئے "سامانِ زیست" سے تعبیر فرمایا ہے۔

مرخ اور عفار کے درختوں کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ اب یہ درخت نایاب ہیں یا کمیاب یا بدوِ اب بھی اس سے چقماق کا کام لیتے ہیں، بالفرض اگر اب یہ درخت نایاب ہوں تو بھی قرآن کا استدلال برمحل اور مؤثر ہے، اس لئے کہ قرآن کے اوّلین مخاطب اس سے واقف تھے، اور پھر قرآن کا اعجاز یہ ہے، کہ الفاظ میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ استدلال آج ہمارے لئے بھی برمحل ہے اور قیامت تک جدید سے جدید تحقیقات سامنے آنے کے بعد بھی برمحل اور اطمینان بخش ہوگا۔

روزانہ گھروں میں جلائی جانے والی لکڑیاں ہرے بھرے درختوں ہی سے تو کاٹی جاتی ہیں ان تروتازہ لکڑیوں کو جن سے گویا پانی ٹپکا پڑتا ہے سُکھا کر ہی آگ روشن کی جاتی ہے، اس کا مشاہدہ بلکہ تجربہ روزانہ ہو رہا ہے۔ پانی سے آگ پیدا کرنا خدا ہی کا کرشمہ ہے، ضد سے ضد کا وجود کائنات میں عام ہے، اور اب تو جدید تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ سب سے زیادہ زوردار اور تیز آگ پانی ہی میں ہوتی ہے۔ جنوبی ہند کے طوفان میں یہ عبرتناک منظر لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، کہ دریا کے پانی سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے اور پانی اُبل رہا تھا اور پھر پانی سے پیدا کی جانے والی بجلی سے حرارت حاصل کرنا اور اس سے کھانے تیار کرنا مشاہدہ ہی نہیں روز کا تجربہ ہے جو خالق پانی سے آگ پیدا کر سکتا ہے، اس کی قدرت سے یہ بات کیوں بعید ہے کہ وہ راکھ اور مٹی سے انسان کو دوبارہ زندہ کر دے گا

۱۲۰ یہ دوبارہ زندگی کے امکان کی ایک اور دلیل ہے ایک دوسرے رُخ سے انسان کے ذہن کو جھنجھوڑا گیا ہے، کہ وہ حقیقت کو پا سکے۔

خدا ہی نے تو یہ آسمان پیدا کئے جن کی پہنائیوں کی کوئی تھاہ نہیں اور یہ زمین پیدا کی جس میں قوت وطاقت کے بے پناہ خزانے ہیں، جس خدا کی قدرتِ کاملہ اور ماہرانہ تخلیق کے یہ کارنامے ہیں وہ انسان جیسی چھوٹی اور کمزور مخلوق کو دوبارہ پیدا کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے، قدرت و تخلیق کے اس شاہکار کو جو شخص بچشم سر دیکھ رہا ہے آخر وہ انسان کی دوبارہ زندگی کو کیوں بعید از امکان اور بعید از عقل سمجھ رہا ہے۔

کیا کسی نادان کا یہ خیال ہے، کہ بس ایک بار حُسنِ اتفاق سے اللہ نے اپنی فنِ تخلیق کا مظاہرہ کیا اور وہ تھک کر بیٹھ رہا، ایک بار کی زور آزمائی میں اس کی قوت تخلیق کُند ہوگئی یا ختم ہوگئی۔ جی نہیں وہ خلاق ہے، بڑا پیدا کرنے والا ہے، وہ سب کچھ پیدا کر سکتا ہے، اور بار بار پیدا کر سکتا ہے وہ اپنی مخلوق کے اجزائے ترکیبی سے بھی بخوبی واقف ہے اور مرنے اور مٹی میں رل مل جانے والی مخلوق کا پور پور اور جوڑ جوڑ بھی اس کے علم میں ہے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ

اے بیٹے! کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی ہو پھر وہ کسی چٹان کے سینے میں ہو، یا آسمانوں کی پہنائیوں میں، ہو یا زمین کی (تہوں) میں ہو اللہ اُسے نکال لائے گا، وہ بڑا باریک بین اور پوری طرح خبر رکھنے والا ہے۔

تخلیق نے خدا کو تھکا دیا ہے اور نہ کوئی چیز خدا کے علم سے پوشیدہ ہے، وہ خلاق اور علیم ہے۔ پھر بھی انسان دوبارہ اٹھائے جانے کو ناممکن تصور کرے، تو یہ کس قدر حیرت انگیز جہالت وحماقت ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(الاحقاف ۳۳)

کیا اُن لوگوں کو یہ سُجھائی نہیں دیتا، کہ جس خدا نے یہ زمین و آسمان پیدا کئے ہیں اور ان کے بنانے میں جو نہ تھکا، وہ یقیناً اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو جلا اُٹھائے، کیوں نہیں بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

وہ بڑا پیدا کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے، اس کا معاملہ تو بس یہ ہے کہ وہ
جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے [۱۲۱]

۱۲۱ یہ آیت قرآن حکیم میں الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ آٹھ جگہ آئی ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ خدا کی تخلیق کو انسانوں کے بنانے اور ترکیب دینے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو نہ وہ اسباب کا محتاج ہوتا ہے، نہ اُسے لیبر اور میٹریل کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اُسے مشینوں اور اوزاروں کا اہتمام کرنا ہوتا ہے، وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی قدرت کاملہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بس کہتا ہے ہو جا! اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے باپ کے بغیر پیدا کیا، تو لوگوں کو یہ بات ناممکن معلوم ہوئی، اور انھوں نے حیرت و تعجب کا اظہار کیا، اللہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ______ اللہ اسباب کا محتاج نہیں ہے، کسی معدوم کو وجود میں لانے کے لئے خدا کا ارادہ اور حکم کافی ہے۔ (آلِ عمران آیت ۴۷، مریم آیت ۳۵)

اور فرمایا اس سے پہلے اللہ تعالیٰ آدمؑ کو پیدا کر چکا تھا، ان کی نہ تو ماں تھیں نہ باپ، مٹی سے پتلا بنایا اور خدا نے کہا ہو جا اور وہ ہو گئے۔ (آل عمران آیت ۵۹)

اور یہ زمین و آسمان بھی تو کچھ نہ تھے، بغیر کسی سابقہ نمونے کے خدا ہی نے ابتداءً ان کو پیدا کیا، خدا زمین و آسمان کا موجد ہے۔

"اللہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اور جس بات کا فیصلہ وہ کرتا ہے، اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے۔ (البقرہ ۱۱۷)

باقی چار مقامات پر یہ آیت دوسری زندگی کے امکان پر دلیل کی حیثیت سے آئی ہے، آخرت کی زندگی اور یوم الحساب کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں، ان کے دلوں میں بات اُتارنے کے لئے خدا نے ارشاد فرمایا، آخر تم خدا کی ذات پر اس کی عظیم صفات اور بے پناہ قدرت و طاقت کے ساتھ کیوں نہیں سوچتے، اس کا معاملہ تو صرف یہ ہے کہ وہ کہہ دے "ہو جا" اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

پس پاک ہے[۱۲۲] وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے[۱۲۳]

"اور جس روز وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ (الانعام ۷۳)

سورۂ نحل میں ذرا زیادہ تفصیل سے بات آئی ہے۔

وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ ۙ لَا یَبۡعَثُ اللّٰہُ مَنۡ یَّمُوۡتُ ؕ بَلٰی وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿ۙ﴾ لِیُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِیۡ یَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡہِ وَ لِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّہُمۡ کَانُوۡا کٰذِبِیۡنَ ﴿﴾ اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰہُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿﴾ (النحل ۳۸-۴۰)

یہ لوگ اللہ کے نام کی کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اس کو پھر سے زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا۔ اٹھائے گا کیوں نہیں یہ تو اس کا وعدہ ہے جس کو اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں، ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین آخرت کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے ہیں، (رہا اس کا امکان تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہو جا" اور بس وہ ہو جاتی ہے۔

۱۲۲۔ "سُبۡحٰن" میں پاکی کا مفہوم بھی ہے اور بلندی اور برتری کا بھی۔ اس لفظ کا استعمال خدا ناآشنا لوگوں کی غلط فہمی، بدظنی اور کوتاہ فہمی سے ذہن کو پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں دو باتوں کے سلسلے میں ذہن صاف کرنا ہے ایک یہ کہ یہ منکرینِ آخرت خدا کی طرف جس کمزوری، عاجزی اور مجبوری کی نسبت کر کے اس کو دوبارہ پیدا کرنے سے معذور تصور کرتے ہیں، خدا کی ذات ان کمزوریوں اور مجبوریوں سے پاک اور بہت بلند و ارفع ہے۔

سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿﴾ (الصّٰفّٰت)

پاک و برتر ہے تمہارا رب ان باتوں سے جو یہ (اس کی قدر نہ جاننے والے) لوگ اس کی شان میں کہتے ہیں۔

دوسری بات جس سے ذہن صاف کرنا ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کی زندگی کا انکار کر رہے ہیں وہ گویا

اس دنیا کی تخلیق کو فعل عبث قرار دے رہے ہیں اور خدا کی ذات اس سے بہت بلند و برتر ہے کہ وہ کوئی عبث فعل کرے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران ۱۹۱)

اے ہمارے رب! تو نے یہ دنیا بے مقصد اور عبث نہیں پیدا کی ہے، تیری ذات اس سے پاک و برتر ہے کہ کوئی فعل عبث کرے۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لینا۔

وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور جس کا حکم پوری کائنات میں چل رہا ہے اور ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ یہ کائنات نظم و ضبط کا ایک شاہکار ہے ایسے مدبّر کائنات کے بارے میں یہ تصور کہ اس نے یہ دنیا یونہی عبث بنائی ہے، اس کا کوئی انجام نہیں یا یہ تصور کہ وہ اس دنیا کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اسے نہیں بنا سکتا، سراسر جہالت، نادانی اور ناسمجھی کا تصور ہے۔ اور اس کی عظمت و قدرت کو نہ پہچاننے کا نتیجہ ہے۔

۱۲۳ "اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے" یہ تنبیہ کا کلمہ ہے۔ کسی حقیقت کا انکار کرنے سے وہ حقیقت نہیں ٹل جایا کرتی، ایک دن یوم الحساب تو بہر حال آنا ہے اور ہر ایک کو اپنی پوری زندگی کے قول و عمل کا حساب دینا ہے، تم چاہو یا نہ چاہو کشاں کشاں تمہیں داورِ محشر کے حضور پیش ہونا ہے، زندگی بھر خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہو، کیا وہ ان کے بارے میں تم سے باز پرس نہ کرے گا۔ اگر اس کے حضور تمہاری پیشی نہ ہو، وہ تمہارے قول و عمل کا حساب نہ لے، اور خیر و شر کا کوئی فیصلہ نہ ہو تو یہ دنیا ایک حکیم علیم خدا کی دنیا تو نہ ہوئی ایک کھلنڈرے کا کھیل ہو گیا۔ خدا نے یہ دنیا عبث نہیں بنائی ہے، سنجیدگی سے فیصلہ کرو، کل خدا کے حضور کیا جواب دو گے؟

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (المومنون ۱۱۵)

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

حیرت اور تعجب کی بات یہ نہیں ہے کہ کل خدا ایک نیا عالم برپا کرے گا اور مٹی میں رل مل جانے والے انسان کو دوبارہ زندہ اُٹھائے گا۔ تعجب اور حیرت کی بات تو یہ ہوگی کہ اگر ایسا کوئی دن نہ آئے۔ اور علیم و حکیم خدا کی دنیا میں پیدا ہونے والا انسان جس کو عقل و شعور بھی بخشا گیا، اچھے بُرے کی تمیز بھی دی گئی اور اچھائی یا بُرائی کو اپنانے کا اختیار بھی دیا گیا وہ مر مٹ کر گل سڑ جائے اور قصہ ختم ہو جائے، نہ ظالم کو اپنے ظالمانہ اعمال کی سزا ملے اور نہ نیک اعمال کا کوئی صلہ بخشا جائے۔ ختم شد

اسلامی تعلیمات پر معیاری کتابیں

قرآنی تعلیمات (محمد یوسف اصلاحی)	**۵۔ اے ذیلدار پارک** (حصہ اول)
حصہ اول 10/- حصہ دوم 10/-	(مولانا مودودیؒ کی عصری مجالس) 14/-
گلدستۂ حدیث (محمد یوسف اصلاحی)	**مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ**
جیبی سائز۔ قیمت 3/50	حصہ اول 8/- حصہ دوم 12/-
داعیٔ اعظمؐ (محمد یوسف اصلاحی) 6/-	**شخصیات** سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ 14/-
آدابِ زندگی 〃 18/-	**۵۔ اے ذیلدار پارک** (حصہ دوم) 14/-
آسان فقہ اول۔ دوم	**انوار القرآن** (محمد ادریس صاحب) 6/-
فقہ اسلامی 〃 6/-	**حدیثِ رسولؐ** (محمد یوسف اصلاحی) -/75
اسلامی معاشرہ 〃 10/-	**رسول کی تعلیم** 〃 -/70
حسنِ معاشرت 〃 10/-	**علامہ فراہیؒ** (عنایت اللہ سبحانیؒ) 10/-
روشن ستارے 〃 13/50	**جلوۂ فاراں** 〃 12/-
خاتونِ خانہ (مظہر ادیب) 5/-	**مجاہد کی اذاں** 〃 12/-
شہسوار (ام سعید) 2/-	**حکایاتِ عزیمت** 4/25
مختصر احکامِ حج 2/50	**رودادِ ابتلاء** 11/-
خط کیسے لکھیں 1/30	**راہِ حق کے دو مسافر** (محمد یوسف اصلاحی) 3/-
صحیح تصورِ دین -/75	**ابن مبارکؒ** 〃 2/-
قافلۂ حق 1/25	**ذکرِ رسولؐ** 〃 1/-
یاد دہانی 1/25	**تحفظ گائے اور ہندوستانی مسلمان** 1/25
جنگ بدر 5/-	عالمِ اسلام 10/-
یا ایہا الناس 5/-	تحریک مجاہدین

مکتبہ ذکریٰ ○ رام پور۔ یوپی۔ انڈیا

سرورق: ٹائٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا